

فردنامہ-٦

علامہ واقف عظیم آبادی



ڈاکٹر نسیم اختر

سلسلہ نمبر-٦

Waqif Azeemaabadi

By

Dr. Nasim Akhtar

- نام کتاب : واقف عظیم آبادی
- مصنف : ڈاکٹر نسیم اختر
- سال اشاعت : 2019ء
- کل صفحات : 128
- کمپوزنگ : مسیح الرحمٰن قاسمی
- ترتیب وتزئین : محمد رضاء اللہ قاسمی
- سرورق : امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
- طابع : تاج آفسیٹ پریس، دریاپور، پٹنہ-۴

رابطہ : 9334020186



ملنے کا پتہ

اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ-۸۰۰۰۰۱

فون نمبر : 0612-2253093، ای میل : directorurdu@gmail.com



مشمولات

⊠	پیش لفظ:	امتیاز احمد کریمی	۴
⊠	علامہ واقف : ایک معروضی تعارف	اسلم جاوداں	۶
⊠	ابتدائیہ:	ڈاکٹر نسیم اختر	۹

عنوانات

⊠	علامہ واقف: ایک نظر میں	۱۲
⊠	احوال و کوائف	۱۵
⊠	واقف: ایک درویش	۳۴
⊠	آرا کا شعری پس منظر	۴۰
⊠	واقف بحیثیت شاعر	۴۴
	الف ـ غزل گوئی	۴۴
	ب ـ نظم نگاری	۵۲
	ج ـ طنز و تغزل	۶۳
	د ـ واقف آرٹ	۷۲
⊠	واقف بحیثیت نثر نگار	۸۲
	الف ـ تنقید	۸۲
	ب ـ صحافت	۹۷
	ج ـ تصوف	۱۰۱
⊠	واقف : ایک اجمالی جائزہ	۱۰۸
⊠	انتخاب کلام واقف	۱۱۴

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر و ادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سربلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی و شعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، فضل حق آزاد، شوق نیموی، انجم مانپوری، یاس یگانہ چنگیزی، بیدل عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، کلیم احمد عاجز، رضا نقوی واہی، واقف عظیم آبادی، رمز عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر و ادب بجا طور ناز کرسکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر و ادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدردان ہے، نیز ان کے ادبی و شعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدر و منزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری و ادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شاد عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، رمز عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فردنامے شائع کئے جا رہے ہیں۔

واقف عظیم آبادی



دبستان بہار کی ایک اہم ادبی وشعری شخصیت کا نام واقف عظیم آبادی ہے۔ ان کی پیدائش ۸؍مارچ ۱۹۱۶ء کو ارول (جہان آباد) میں ہوئی۔ ۴؍سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ ان کو لے کر آرہ چلی آئیں اور محلہ چودھرانہ میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئیں۔ جہاں اُن کی عمر کا طویل حصہ گزرا۔ ۱۹۶۶ء میں وہ شادی کے بعد اپنی سسرال گولک پور، پٹنہ میں ہی بس گئے۔ اسی لئے کچھ لوگ ان کو واقف عظیم آبادی اور کچھ لوگ واقف آروی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

واقف عظیم آبادی کو فارسی، عربی اور اردو زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ سخنور تھے۔ طویل عرصے تک پٹنہ کے روز نامہ 'سنگم'، 'صدائے عام'، 'قومی تنظیم' اور 'ہمارا نعرہ' میں واقف آرٹ کے عنوان سے مزاحیہ قطعات لکھتے رہے اور علامہ واقف کے نام سے شہرت مقبولیت اور عزت حاصل کرتے رہے۔ وہ ایک قادر الکلام اور غضب کے ذہین شاعر تھے۔ وہ فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔ لوگ اُن سے گھنٹے بھر میں طویل سہرے لکھوا کر لے جاتے تھے۔ اِس فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

واقف عظیم آبادی بڑے کثیر المطالعہ اور دانشورانہ صلاحیتوں کے حامل شاعر وادیب تھے۔ ان کی علمی و دانشورانہ اہمیت کے پیش نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ان کو ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک روزانہ لائبریری میں مدعو کیا اور انھیں اپنی یادداشت قلم بند کرنے کو کہا۔ واقف کی یہ قیمتی تحریر لسانی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، مذہبی اور تحقیقی اعتبار سے دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں اور یہ خدا بخش لائبریری میں بارہ جلدوں میں محفوظ ہے۔

اس فرد نامہ کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر ایک اچھے محقق، مبصر، صحافی، ادیب اور ناقد ہیں۔ اردو زبان صحافت اور ادب سے ان کا گہرا لگاؤ ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک بہترین محقق ہیں اور ان کی تحریریں تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ ملک کے صف اول کے دانشوران ادب اور ناقدین نے نسیم اختر کی تحریر وتصنیف کی ستائش کی ہے۔ ۱۔ تاثرات ۲۰۰۲ء، ۲۔ نیپال میں اردو ۲۰۰۴ء، ۳۔ تلاش وتصنیف ۲۰۱۳ء، ۴۔ طرز سخن ۲۰۱۴ء، ۵۔ باتیں 2015ء، ۶۔ رنگ و آہنگ ۲۰۱۶ء تحقیقی نوعیت کی قابلِ مطالعہ کتابیں ہیں۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

علامہ واقف: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

علامہ سید شاہ فضلِ امام واقف عظیم آبادی کی پیدائش ۱۸؍مارچ ۱۹۱۶ء کو ارول (سوسنہ) ضلع جہان آباد میں ہوئی۔ والد کا نام سید شاہ منظر امام اور والدہ کا نام صفیہ خاتون تھا۔ ان کا تعلق ایک زمیندار اور ادبی خانوادے سے تھا۔ معروف افسانہ نگار شکیلہ اختر اُن کی چچا زاد بہن تھیں اور سرکردہ افسانہ نگار ادیب وشاعر اختر اورینوی اُن کے چچا زاد بہنوئی تھے۔ چار سال کی عمر میں اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اِس کے بعد اُن کی والدہ علامہ واقف کو لے کر آرہ کے محلہ چودھرانہ میں مستقل قیام پذیر ہوگئیں، وہیں اُنہوں نے بڑی حکمت اور عزم وحوصلے سے اُنہیں پالا پوسا، پروان چڑھایا۔ اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، پھر اُنہوں نے مدرسہ حنفیہ، میر گنج آرہ میں تعلیم حاصل کی۔ اُس کے بعد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت کی سند پائی۔ آزادی کے بعد جب زمینداری کا خاتمہ ہوا تو ساری جائداد جیسے تیسے فروخت ہوگئی۔ علامہ واقف ۱۹۶۶ء میں اپنی سسرال گولک پور پٹنہ میں مستقل سکونت پذیر ہوگئے اور یہیں شعروشاعری کو اپنے اہلِ خاندان کے لیے ذریعہ کفالت بنایا۔

علامہ واقف کی شادی ۱۹۴۴ء میں مسوڑھی (ضلع پٹنہ) کے ڈاکٹر عبدالحمید کی صاحبزادی نفیسہ خاتون سے ہوئی، جن سے اُنہیں پانچ بیٹیاں، شفقت خاتون، فردوسی خاتون، مسرّت جہاں، شادمانی جہاں، شادابی خاتون اور ایک بیٹا اکبر امام کاشف ہوئے۔

اپنی بے مثال علمی وادبی صلاحیت کے سبب واقف عظیم آبادی دنیائے شعروادب میں علامہ واقف کے نام سے مشہور ومعروف ہیں۔ ان کی شاعری زمینی حقائق سے پیوستہ اور شعری حسن سے آراستہ ہے۔ پٹنہ کے روزناموں 'سنگم'، صدائے عام، ہمارا نعرہ وغیرہ میں ان کے قطعات ''واقف آرٹ'' اور ''واقفیات'' کے نام سے شائع ہوتے رہے، جس سے اُنہیں عوام وخواص میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اس عنوان کے تحت سماجی، سیاسی، مذہبی، لسانی، قومی وبین الاقوامی مسائل پر طنزیہ ومزاحیہ انداز میں قطعات لکھ کر اپنی ایک الگ شناخت حاصل کی۔ سنجیدہ شاعری میں بھی علامہ واقف کا ایک منفرد اور اعلیٰ

مقام ہے۔ بہار میں اپنی طرز کے وہ ایک منفرد اور ممتاز اردو شاعر تھے۔ ان کی تخلیقات جس قدر مشاعروں میں پسند کی جاتی تھیں، اسی قدر اردو روزناموں کے توسط سے اردو آبادی میں بھی مقبول تھیں۔

پروفیسر عبدالوہاب اشرفی نے علامہ واقف کی شعری و ادبی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

''سید شاہ فصلِ امام واقف عظیم آبادی جنہیں لوگ علم اور مرتبہ کی وجہ سے علامہ واقف کے نام سے یاد کرتے ہیں، متعلقہ سرزمین کی ایک پُر بہار اور پُر وقار شخصیت کا نام ہے۔ وہ خود تو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے؛ لیکن اپنی گراں بہا نگارشات کا ایسا سرمایہ چھوڑ گئے، جسے نہ صرف یادگارِ واقف سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؛ بلکہ سیاست، تہذیب اور شعر و شاعری کے ضمن میں ایک قیمتی تحفہ کے طور پر محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ ۔ ۔ علامہ زبان و بیان پر غایت دسترس اور قدرت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں الفاظ اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح نظر آتے ہیں''۔

علامہ واقف ایک شانِ استغنا کے حامل تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی کتابوں کی تدوین اور اشاعت کی پروا نہیں کی، لہٰذا ان کے ذریعہ شائع کردہ کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات ہزاروں ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، جن کی تدوین کے بعد ایک درجن سے زائد بیش قیمت کتابیں معرضِ وجود میں آسکتی ہیں، لہٰذا ان کی علمی و ادبی حیثیت کے پیشِ نظر اصحابِ فکر و نظر نے ان کی کچھ تخلیقات مدون کر کے کتابی شکل میں شائع کیں ہیں۔ ان کی علمی، ادبی و تاریخی معلومات اور قاموسی ذہن کے پیشِ نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے ڈائرکٹر عابد رضا بیدار نے ان سے بہار اور ان کے آبائی شہر آرہ کی مکمل تاریخ طویل عرصے تک قلم بند کروائی، جس میں سرزمین آرہ اور ریاست بہار کے علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی، مذہبی تمام پہلوؤں پر بخوبی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ان کی تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

واقف عظیم آبادی تقریباً ۶۰ برسوں تک نثری اور شعری تخلیقات میں سرگرم رہے۔ اردو ادب میں ان کی خدمات بیش قیمت اور بے نظیر ہیں، جن کو مرتب اور مدون کر کے شائع کرنا ہمارا ادبی فریضہ ہے۔

انتقال: علامہ واقف کا انتقال ۶ رستمبر ۱۹۹۳ء کو تقریباً ۸۷ برس کی عمر میں آرہ میں ہوا۔

تدفین: علامہ واقف کو اُن کے آبادی قبرستان منشا پانڈے میں دفن کیا گیا۔

چند تصنیفات و تالیفات

(۱) لطفِ ستم (انتخاب کلامِ واقف) مرتب: سید جاوید حسن

(۲) رازہائے درونِ پردہ (شعری مجموعہ) مرتب: سید اکبر امام کاشف

(۳) گفتنی ناگفتنی (مزاحیہ شعری مجموعہ) مرتب: سید اکبر امام کاشف

(۴) گلدستۂ نعت ومنقبت (نعت ومنقبت کا مجموعہ)
(۵) تاریخ بہار (علامہ واقف کی یادداشت پرمبنی تاریخ بہار)
(۶) مضامین واقف عظیم آبادی (مقالوں کا مجموعہ)

چند منتخب اشعار

تجھ پہ تو یہ فرض ہے اے بے شعار زندگی
ٹوٹ جائے گا کسی دن یہ خمارِ زندگی

زباں پہ شکوۂ ایام آہی جاتا ہے
کچھ اس طرح بھی ترا نام آہی جاتا ہے

کون واقف ہے جسے نانِ شبینہ کی تلاش
وہ گداگر بے نوا وہ شاعرِ خانہ خراب

عید کا دن ہے فریب یار کی باتیں کرو
اپنے سیکولر روزہ و افطار کی باتیں کرو

جو غلامِ درِ خواجہ نہیں ہونے پاتے
قطرے رہ جاتے ہیں دریا نہیں ہونے پاتے

پیری میں ہے رنگِ نوجوانی ساقی
رعنائی دل ہے زندگانی ساقی

نہ پوچھو مجھ سے زمانہ کو کیا دیا میں نے
یزیدیوں کو حسینی بنا دیا میں نے

چالاک ہے عیّار ہے معلوم نہیں کیوں؟
جو شخص ہے مکار ہے معلوم نہیں کیوں؟

لطفِ ہنگامۂ میخانہ بدل جائے گا
آپ کی فکر کا پیمانہ بدل جائے گا

خار زار زندگی کیا ہے گلستاں بوستاں
شرط ہے لیکن گل و گلزار کی باتیں کرو

ستم ہے مجھ پہ قسمت کا خدا کا قہر ہے مجھ پر
کہ میری آہ کو آتش فشاں ہونا نہیں آتا

نسیم صبح گر پھولوں کو خنداں کرنہیں سکتی
تو زیادہ دیر تک سیر گلستاں کرنہیں سکتی

آپ قطرہ سے اگر موج میں دریا ہوجائیں
لاکھوں طوفان جو پنہاں ہیں وہ پیدا ہوجائیں

زبانِ ثانوی بن کر ہوئی ہے جلوہ گر اردو
حکومت کا یہ سکّہ ہے ادھر ہندی اُدھر اردو

بے آئینہ قلب سنورتی نہیں قومیں
بے روح نہ ہوجائیں تو مرتی نہیں قومیں

بے امتیاز فکر و نظر دیکھتے رہے
تازندگی وہ تازہ خبر دیکھتے رہے

رو کر کیا جہالتِ قومی کا تذکرہ
ہنس کر فساد علم و ہنر دیکھتے رہے

یہ واقف آرٹ کیا ہے سمجھ میں نہ آسکا
احساں جناب کا ہے اگر دیکھتے رہے

مومن ہلاکِ لذتِ افطار ہو گیا
لیکن زباں پہ اس کے ہے جنت کی بات چیت

رکھتے ہیں وہ بلندیٔ گفتار فطرتاً
شکوے کا شائبہ نہ شکایت کی بات چیت

— اسلم جاوداں

ابتدائیہ

تقریباً پچیس سال کا طویل عرصہ میں نے علامہ شاہ سید شاہ فضل امام واقف اروی، آروی، عظیم آبادی سے بہت قریب رہ کر گزارا۔ جس میں ۸۳-۱۹۸۰ء کا وہ زمانہ بھی شامل تھا جب میں روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ کے حلقہ ادارت سے وابستہ تھا، جہاں علامہ کے بھی شب و روز کا زیادہ تر حصہ گزرتا تھا۔ دفتری اوقات میں شاید ہی ایسا دن ہو کہ انہوں نے اخبار کے لیے ''واقف آرٹ''، ''طنز و تغزل''، یا حالات حاضرہ پر کوئی مضمون نہ لکھا ہو۔ کبھی کبھی ''سنگم'' پٹنہ کا اداریہ بھی سپرد قلم کرتے تھے۔ یہ تو ''سنگم'' پٹنہ کے ساتھ ان کا معاملہ تھا، جو کئی دہائیوں سے بدستور جاری تھا۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے ''آؤٹ ڈور سروسز'' کا سلسلہ بھی رہتا، چونکہ سبزی باغ کا علاقہ ایک زمانہ سے اردو پریس کو راس آتا رہا، لہٰذا میرا بارہا مشاہدہ رہا کہ کسی نہ کسی روزنامہ، یا ہفتہ وار سے کوئی اسٹاف آتا اور ان سے اپنی مطلوبہ ضروریات کی تکمیل کے ساتھ خوشی بخوشی رخصت ہوتا۔ انہیں مصروفیات میں وہ خوش گپی کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے اور کبھی کبھی ''سنگم'' کے دفتر سے نکل کر رکشہ لیتے، جو انہیں ہوٹل، خدا بخش لائبریری، یا ان کے کسی قدردان کے یہاں لے کر چل پڑتا۔ معمول تو یہ تھا کہ شام ڈھلنے سے پہلے وہ پھر اپنی جگہ انہیں واپس پہنچا جاتا اور اگر اسی دوران ان کا موڈ بدلا تو پھر ہفتہ دس روز تک غائب؛ یعنی کسی قدردان نے انہیں روک لیا، یا انہوں نے خود وہاں ڈیرہ جمالیا؛ کیوں کہ انہیں احساس تھا کہ:

میں چمن میں چاہے جہاں رہوں
مرا حق ہے فصل بہار پر

علامہ کی دانشوری اور سخنوری کا ایک زمانہ معترف تھا۔ ان کی قلندرانہ طبیعت کے چرچے عام تھے۔ میں نے بھی مذکورہ خوبیوں کے علاوہ ان کی ذہانت وذکاوت، غیر معمولی حافظہ، گہرے

مطالعہ، زود گوئی و برجستگی اور نثری تحریروں کا جادو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کا وضع قطع بھی میرے سامنے تھا اور ان کی روحانی و وجدانی کیفیت بھی میری نگاہوں میں تھی، جلال و جمال بھی دیکھا اور خفگی و دشنام طرازیوں کا شکار بھی ہوا، البتہ میرے حق میں ان کی دعائیں زیادہ غالب رہیں۔ موصوف کے زبان و بیان کی اثر پذیری؛ بلکہ سحر انگیزی کا وہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جسے جو کہا وہ اکثر ہو بھی جاتا، جن کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں۔ غرض کیا شخصیت تھی، کیا تبحر علمی تھا، کتنا بلند مذاق اور بالیدہ شعور تھا، کیا بصیرت و بصارت اور فراست ایمانی تھی اور فاقہ مستی میں بھی کیا غضب کی آسودگی اور شگفتگی تھی۔

علامہ واقف اپنے زمانہ میں علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی آندھی تھے، جس کے سامنے چراغوں کی لَو تھر تھر کانپتی اور اپنے وجود کی بقا کے لیے دہائی دیتی نظر آتی۔ افسوس کہ ان کی بے نظیر تخلیقات کچھ تقسیم ہند کی نذر ہو گئیں، کچھ نقل مکانی میں اخباروں کی فائلوں کی زینت بن کر رہ گئیں۔ قابل مبارک باد ہیں سید جاوید حسن جنہوں نے ان کی شاعری کا ایک مختصر سا مجموعہ ''لطف ستم'' اور اکبر امام کاشف نے ''راز درون پردہ'' اور ''مضامین واقف عظیم آبادی'' میں کچھ باقیات محفوظ کر دیں۔

ایک زمانہ سے مجھے اس کا شدید احساس رہا کہ علامہ واقف جیسی عبقری شخصیت اور ان کی ادبی و شعری خدمات پر مختلف پہلوؤں سے کام کرنے اور انہیں منظر عام پر لانے کی سخت ضرورت ہے۔ ان کے احوال و آثار ایک نہیں کئی سیمیناروں کی متقاضی ہیں، تاکہ علم و ادب میں ان کا صحیح مقام متعین کیا جا سکے۔ افسوس کہ سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں جن کے ہاتھوں میں اردو اخبار و رسائل کی باگ ڈور رہی انہوں نے بھی واقف کو نظر انداز کیا۔ سرکاری عنایات سے بڑے بڑے سیمیناروں کے دعویداروں نے بھی چشم پوشی کی یا پھر مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ واقف جیسے قد آور اور نابغۂ روزگار کے کارناموں تک رسائی کا انہوں نے خود کو اہل نہیں سمجھا۔ راقم نے اپنی کتاب ''تلاش و تصنیف'' (۲۰۱۳ء) میں ''کچھ سربستہ تخلیق کا انکشاف'' عنوان کے تحت ۳۲ رصفحات پر مشتمل ایک مضمون شامل کیا ہے جو واقف کی شخصیت، شاعری اور نثر نگاری کی ہلکی سی جھلک پیش کرتا ہے۔

خدا بھلا کرے اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، بہار، پٹنہ کے ارباب حل و عقد کا جنہوں نے ۱۸ رمارچ ۲۰۱۸ء کو واقف پر ایک ''یادگاری تقریب'' منعقد کی اور اس موقع پر ایک دیدہ زیب تعارفی فولڈر بھی شائع کیا، جس میں ایک جگہ یہ جملہ بھی درج ہے: ''ان کی تخلیقات ہزاروں

صفحات پر مشتمل ہیں، جن کی تدوین کے بعد ایک درجن سے زائد بیش قیمت کتابیں معرض وجود میں آسکتی ہیں''۔

میں ممنون ہوں جناب امتیاز احمد کریمی ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ اور ڈاکٹر اسلم جاوداں، اردو پروگرام آفیسر، اردو ڈائرکٹوریٹ کا کہ علامہ واقف پر جن کی نگاہِ انتخاب پڑی۔ یہ مختصر سی کتاب انہیں حضرات کی تحریک وترغیب کا نتیجہ ہے۔ متعین اوقات اور محدود صفحات میں جو کچھ ہوسکتا تھا، اسے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، اس موضوع پر کسی بھی تفصیلی کتاب کے لیے اسے محض ایک نقش اوّل سمجھنا چاہیے۔

یہ بھی المیہ ہے کہ اس کی تصنیف کے ابتدائی مراحل میں ہی میں ناگہانی مکروہات وحادثات کی زد میں آگیا، یہاں تک کہ اس کی تکمیل کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا کہ ایسے میں علم وادب کی دو اہم شخصیت پروفیسر محسن رضا رضوی، صدر شعبۂ اردو، اورینٹل کالج پٹنہ سٹی اور پروفیسر احمد بدر، شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور نے میرے حوصلوں کو شکست خوردگی سے بچالیا اور میں اس لائق ہوسکا کہ یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ احمد بدر اور محسن رضا رضوی صاحبان نے اپنی مصروفیات کے باوجود واقف سے متعلق چند اہم نکات سے مجھے آگاہ کیا۔ خدا انہیں مزید علمی ترفع عطا کرے؛ تاکہ معاصرین کے علاوہ متعاقب نسل بھی ان سے علمی وتحقیقی استفادہ کرتی رہے۔

میں جناب مسیح الرحمٰن قاسمی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے بڑی جانفشانی سے کتاب کی کمپوزنگ کی۔ میرے شکریہ کے مستحق جناب حامد حسین ندوی بھی ہیں، جنہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود کتاب کے مسودے پر ایک نظر ڈال کر اسے قابل اشاعت بنایا۔

ڈاکٹر نسیم اختر

پٹنہ سیٹی، پٹنہ

علامہ واقف: ایک نظر میں

نام	: سید شاہ فضل امام
تخلص	: واقف
خطاب ولقب	: علامہ اور لسان الملک
مولد	: ارول (قدیم ضلع گیا، اب ارول خود ضلع ہے)
پیدائش	: ۱۸؍مارچ ۱۹۱۶ء، مطابق ۱۳؍جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ بروز شنبہ
دادیہال	: ارول
نانیہال	: آرہ، محلہ چودھرانہ
جدامجد	: حضرت سید شاہ مخدوم شمس الدین سمن باز، ارولی
والد	: سید شاہ منظر امام
والدہ	: بی بی صفیہ خاتون (متوفی: ۳۰؍اپریل ۱۹۶۶ء)
دادا	: سید شاہ حزبر امام
نانا	: چودھری منظور احمد
زہر خورانی	: ۱۹۱۹ء عید کے دن کسی نے انہیں زہر دے دیا، حکیم اجمل خاں کے زیر علاج رہے اور شفایاب ہوئے
رسم بسم اللہ	: ۱۹۲۰ء مطابق ۲۱؍رمضان المبارک ۱۳۳۷ھ چار سال چار ماہ، چار دن کی عمر میں امیر شریعت حضرت مولانا سید شاہ بدر الدین پھلواروی کے ذریعہ

مادرانِ علمی	:	(الف) والدہ ماجدہ کے زیرِ نگرانی
		(ب) مدرسہ حنفیہ میر گنج آرہ سے مولوی
		(ج) مدرسہ وحیدیہ آرہ سے عالم
		(د) مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت
تلامذہ	:	حضرت علامہ تمنا عمادی پھلواروی
سفر فرنگی محل لکھنؤ	:	۱۹۳۱ء
سب سے پہلا شعر (۱۲ سال کی عمر میں)	:	اگر بکرا مارے گا بکری کو سینگ
		تو بکری بھی مارے گی بکرے کو سینگ
مشاعرے کے لیے کہی گئی سب سے پہلی غزل	:	۱۹۳۸ء، منعقدر ہائش گاہ واقف عظیم آبادی، آرہ زیرِ صدارت: حضرت تمنا عمادی پھلواروی
مناکحت	:	شاکرہ خاتون بنت ڈاکٹر عبدالحمید، مسوڑھی پٹنہ
اولاد	:	۵ رلڑکیاں اور ایک لڑکا
ادبی صحافت کا پہلا دور	:	۱۹۴۷ء کے پہلے سے خصوصی طور پر الکوثر، ریاست، روزنامہ ہند، الفقیہ، انقلاب
مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات	:	۱۹۴۶ء، گاندھی سنگر ہالیہ، پٹنہ
معاشی زوال کی ابتدا	:	۱۹۴۷ء کے بعد سے
آرہ سے پٹنہ مراجعت	:	۱۹۶۶ء
روزنامہ سنگم سے وابستگی	:	۱۹۶۶ء سے
ہفتہ وار طشت از بام کا اجرا	:	۱۹۷۲ء
راج بھون بہار کی دعوت	:	۱۸/اکتوبر ۱۹۷۹ء
		(گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کی ضیافت)
بزمِ واقف کی بنیاد	:	غالباً ۱۹۷۲ء
دہلی کا سفر	:	۱۹۸۰ء

اجمیر کا سفر	:	۱۹۸۳ء
محکمہ راج بھاشا اردو سے وظیفہ مقرر	:	۲۲/اکتوبر ۱۹۸۸ء
		زیر اہتمام خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ
نگارشات واقف	:	کل ۱۲/جلدوں میں، ۹۳۔۱۹۸۵ء کے دوران
پٹنہ سے آرہ روانگی	:	۵/دسمبر ۱۹۹۳ء
وفات	:	۶/دسمبر ۱۹۹۳ء
تدفین	:	منشا پانڈے کا باغ، آرہ، ۷/دسمبر بعد نماز عصر



احوال وکوائف

پیدائش اور خاندانی پس منظر

اردو کے معروف شاعر، صاحب طرز نثر نگار اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل علامہ سید شاہ فضل امام واقف کی پیدائش ۱۸ ؍مارچ ۱۹۱۶ء کو موجودہ ضلع ارول (قدیم ضلع گیا) میں ہوئی، جو دریائے سون کے کنارے واقع ہے۔ یہ وہی سون ہے، جس سے اختر اورینوی نے اپنے جذباتی لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نظم ''دریائے سون'' میں کہا تھا:

وہ سون کے ساحل کے دل افروز نظارے
دامن میں لیے جلوۂ رنگیں کے شرارے
ہیں اختر بیتاب کو سو جان سے پیارے
اے سون بلالے تو مجھے اپنے کنارے

واقف عظیم آبادی کی دادیہال ارول، نانیہال آرا، وطن ثانی پٹنہ؛ یعنی عظیم آباد تھا اور یہ تینوں مقامات انہیں عزیز تھے، چنانچہ انہیں نسبتوں سے وہ اپنے نام اور تخلص کے ساتھ پورے اہتمام سے تاحیات ارولی، آروی اور عظیم آبادی لکھتے رہے۔ البتہ سولہ، سترہ سال کی عمر تک وہ صرف واقف آروی لکھتے تھے۔ اپنی قادر الکلامی اور تبحر علمی کی وجہ سے 'علامہ' اور 'لسان الملک' جیسے خطابات والقاب سے معروف ہوئے۔ نسبی اور روحانی طور پر واقف کا تعلق اس صوفی خانوادے سے تھا، جو

تقریباً نو سو سال کے طویل عرصے سے بالخصوص بہار اور بالعموم برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ سری لنکا اور برما میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کیے ہوئے تھا۔ ان کے جد امجد حضرت سید شاہ مخدوم شمس الدین سمن باز اروی تھے، جو مخدومِ جہاں حضرت شرف الدین یحیٰؒ منیریؒ کے خالہ زاد حضرت مخدوم تیم الدین چشتی کے مجاز یافتہ خلیفہ تھے۔ شاہ سمن اروی سے اپنی نسبت و عقیدت ظاہر کرتے ہوئے واقف کہتے ہیں:

لوحِ محفوظ ترا عرشِ معلیٰ تیرا
شاہ سمن ہے خداداد یہ رتبہ تیرا
بڑھ گئی سید جیلاں کی عنایت مجھ پر
انہیں معلوم ہوا جب ہوں میں پوتا تیرا
طبع واقف کی روانی ہے کرامت تیری
موج در موج ہمیشہ ہے یہ دریا تیرا

واقف کے ننھیال کے افراد بھی اپنے عہد کے ممتاز و مفتخر علمی و ادبی زمینداروں میں تھے۔ واقف کے پردادا سید شاہ حزبر حسین اپنے عہد کے جید عالم دین تھے۔ مولانا اسمٰعیل دہلوی کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' جب منظر عام پر آئی تو اس کے خلاف سب سے پہلے فتویٰ انہوں نے ہی دیا تھا۔ ان کے بعد علامہ فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علما کے فتاوے سامنے آئے۔ ان کے دادا سید شاہ اظہر حسین اپنے عہد کے انتہائی خوش حال زمین دار تھے۔ شعر و سخن میں بھی یکتائے زمانہ تھے۔ وہ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے نانا چودھری منظور حسین محلہ چودھرانہ، آرا کے رئیس اور اپنے زمانے کے قادر الکلام شاعروں میں تھے۔ ان کا کلام مرزا عنایت بیگ عنایت آروی تلمیذ صفیر بلگرامی کے اخبار ''آفتابِ عالم'' آرا کے علاوہ آرا کے قدیم گلدستوں میں موجود ہے۔ واقف کے والد سید شاہ منظر امام کا شمار بھی ارول کے روسا اور نغز گو شعرا میں ہوتا تھا۔ وہ داغ دہلوی کے عقیدت مندوں اور علی احمد عشرت گیاوی کے حلقہ تلامذہ میں تھے۔ غرض دو طرفہ شعر و سخن اور علم و ادب کے ساتھ جاہ و منصب، فارغ البالی، فیاضی، دولت و ثروت اور رعب و دبدبہ خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس گھرانے کی سخاوت سے خاص و عام فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔

چودھری شرافت حسین (ایم ایل سی)، چودھری ریاست حسین (سول سرجن)، چودھری وجاہت حسین (ڈپٹی گورنر ریزو بینک آف انڈیا، بمبئی) اور چودھری حفاظت حسین (کمشنر بنارس) واقف کے حقیقی ماموں تھے۔ ملک کی دیگر قدآور اور معروف شخصیتوں میں سید شاہ عمیر (ایم پی) جنگ آزادی کے ممتاز سالاروں میں تھے، جن کی قیادت میں ہندو مسلم اتحاد نے انگریزی حکومت کی چولیں ہلادی تھیں۔ اس خاندان کی قربانیاں دوسرے مجاہدین آزادی سے کم نہ تھیں۔ حدتو یہ ہے کہ ان کی بعض خواتین بھی مردوں کے شانہ بشانہ رہیں، جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد پر ملک کی آزادی کے مفاد کو ترجیح دی۔ سید شاہ محمد زبیر اور سید شاہ زہیر بھی واقف کے چچا تھے۔ بیتاب صدیقی کی کتاب ''معمار قوم: محمد زبیر بار ایٹ لا'' اس خانوادے کے کارناموں کی ایک اہم دستاویز ہے۔ یہی خاندانی سلسلہ سید شاہ مشتاق احمد سے ہوتا ہوا سید شاہ طارق انور (سابق رکن پارلیمنٹ) تک جا پہنچتا ہے۔ دیگر ممتاز علمی وادبی ہستیوں میں معروف افسانہ نگار شکیلہ اختر واقف کی چچازاد بہن اور سرکردہ ادیب وشاعر اور نامور استاد پروفیسر اختر اورینوی چچازاد بہنوئی تھے۔

شفقت پدری سے محرومی

واقف نے ایک ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں، جو کئی اعتبار سے بہار کا منفرد اور معزز گھرانا تھا؛ مگر اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ ان کی پیدائش کے ساتھ ہی چند نامساعد حالات نے انہیں گھیر لیا۔ ان کے والد سید شاہ منظر امام کے بارے میں ایک روایت یہ ہے کہ جب واقف اپنی والدہ صفیہ خاتون (متوفی ۳؍اپریل ۱۹۶۶ء) کے بطن میں تھے تو انہیں کسی نے زہر دے دیا تھا، جس کی وجہ سے ان کی موت واقع ہوگئی تھی۔ بقول انوار محمد عظیم آبادی:

> ''علامہ واقف کے والد محترم، ان کی ولادت سے پہلے ہی مسموم ہو کر وفات پاچکے تھے''۔

(مدیر معاون: 'زبان وادب'، پٹنہ، مئی ۲۰۱۵ء، ص:۱۹)

جب کہ ''رازہائے درونِ پردہ'' کے مرتب سید کاشف امام کے مطابق:

> ''جب ان کی عمر صرف چار سال کی تھی کہ ان کے والد سید شاہ منظر امام صاحب پراسرار حالت میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے''۔ (ص:۱۹)

سید شاہ منظر امام کی وفات کے سلسلے میں تضاد ہے، ان کی موت واقف کی پیدائش سے قبل ہوئی، یا بعد، یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ عہد طفلی میں ہی واقفِ شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ واقف کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۹ء میں جب وہ تین سال کے تھے تو عین عید کے دن کسی نے انہیں زہر دے دیا، جس نے رفتہ رفتہ اپنا اثر بھی دکھانا شروع کر دیا اور وہ بتدریج موت کی دہلیز کی جانب بڑھنے لگے۔ اتفاق سے انہی دنوں حکیم اجمل خاں طبی کانفرنس میں پٹنہ آئے ہوئے تھے، ان کی موجودگی کو غنیمت جانتے ہوئے سید شاہ محمد عمیر نے واقف کا معائنہ ان سے کرایا اور وہ حکیم صاحب کے زیر علاج رہے، یہاں تک کہ شفایاب ہوئے۔ صحت مندی کے بعد چار سال کی عمر میں ۱۹۲۰ء میں ان کی والدہ انہیں لے کر اروَل سے اپنے میکے آرا چلی آئیں، جہاں انہوں نے محلہ چودھرانہ میں سکونت اختیار کی۔

رسم بسم اللہ، تعلیم اور رہن سہن

۱۹۲۰ء مطابق ۲۱ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو چار سال چار ماہ کی عمر میں عین سحری کے وقت واقف کی رسم بسم اللہ حضرت امیر شریعت شمس العلماء مولانا سید شاہ بدر الدین پھلواروی نے کی۔ اس کے بعد ابتدائی تعلیم والدہ کی نگرانی میں اس حد تک ہوگئی کہ انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں اچھی صلاحیت پیدا کر لی۔ موصوفہ نے ان کی پرورش و پرداخت بڑے عزم و حوصلہ سے کی اور ان کے ذہن کو صحیح رخ عطا کرنے میں گرانقدر کارنامہ انجام دیا۔ بنیادی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ مدرسہ حنفیہ، میر گنج، آرا میں ہوا، جہاں سے مولوی کی سند حاصل کی، جب کہ مدرسہ وحیدیہ، آرا سے عالم درس نظامی اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے فضیلت کی سند پائی۔ دورانِ تعلیم ان کے ابتدائی اوقات جس شان سے گزرے اس کی تصویر شگفتہ عارف نے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

> ''مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں واقف صاحب الپکا جسے آج کل گارڈن کہا جاتا ہے کی شیروانی، چوڑے مہری کا زربفت کا پائجامہ، ترکی ٹوپی اور سلیم شاہی جوتا پہنتے، آگے پیچھے دو مامائیں کتابوں کا بستہ اور ٹیفن کا بکس لیے جایا کرتی تھیں، ان کے دسترخوان پر بلا مبالغہ جب تک آرا میں رہے، دس پانچ آدمی ضرور شریک رہا کرتے تھے''۔

('زبان و ادب'، پٹنہ جلد ۲۲، شمارہ ۲-۱، ص: ۶۴-۶۳، ۱۹۹۶ء)

جب کہ ان کے ایام شباب کی بہاروں کا ذکر پروفیسر خواجہ افضل امام، سابق صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی نے یوں کیا ہے:

''۳۶/۳۵ کا زمانہ تھا، ہم گھول ریلوے اسکول کے متعلّم تھے اور اپنے پھوپھا علامہ تمنا عمادیؒ کے ساتھ پھلواری شریف میں رہتے تھے۔ ہم نے بار ہا ابراہیم نجم ندوی، بہاء الدین فیض عظیم آبادی، ارمان آروی، پرویز شاہدی، اختر قادری، فضل امام واقف، شفیع پھلواروی وغیرہم کو علامہ تمنا عمادیؒ کے مکان موسوم بہ ''دار الادب'' پھلواری شریف میں کئی کئی دن قیام کرتے دیکھا ہے۔ تلامذہ تمنا عمادی میں واقف صاحب کی ذات ہر لحاظ سے نمایاں تھی۔ بہترین سرج کی شیروانی، آنکھ پر سنہری فریم کا چشمہ، ہاتھ میں چاندی کے مٹھ والی چھڑی، پیر میں پیٹنٹ پمپ کا شو، قیمتی لٹھے کا پائجامہ، سرمہ لگائے ہوئے، سر پر ترکی ٹوپی، سیاہ خشخشی داڑھی، منہ میں پان، شیروانی کی جیب میں گھڑی، جس کی چین سونے کی، جب غزل پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا۔ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا جیسے کہہ رہے ہوں:

شکل یوسف کی جو تعریف سنی فرمایا
منصفی شرط ہے دیکھو ادھر ایسی تو نہ تھی

('مضامین افضل'، ص: ۱۱۱-۱۱۲)

رشتہ ازدواج

۱۹۴۳ء میں واقف کی شادی سیدہ شاکرہ خاتون بنت ڈاکٹر سید عبدالحمید، قاضی چک مسوڑھی، پٹنہ سے انجام پائی، جو ایک دیندار گھرانے کی نیک سیرت خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ راضی بہ رضا کے اصول پر تا عمر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس رشتہ سے انہیں ایک بیٹا (اکبر امام کاشف) اور پانچ بیٹیوں سے نوازا۔

مہمان نوازی

واقف بذات خود بہت شاہ خرچ، طبعاً انتہائی فیاض اور مزاجاً مہمان نواز تھے۔ ان کی یہ خوبیاں ان کی شاہی زندگی سے لے کر قلندری کے زمانے تک قائم رہیں۔ ان کا دل اور ہاتھ زندگی

بھر کشادہ رہا۔ ان کے دروازے یا ان کے پاس سے کوئی ضرورت مند کبھی واپس نہیں ہوتا؛ بلکہ اکثر اپنی امیدوں اور ضرورتوں سے زیادہ ہی لے کر جاتا۔ کسی سائل کو کبھی ریزگاری نہیں دی۔ قدرتی آفات ہوں، یا ناگہانی واقعات، وہ مالی معاونت میں ہمیشہ سبقت لے جاتے۔ شعرائے کرام کی قدر دانی اور دادودہش ان کی فطرت ثانیہ تھی، جب تک آرا میں رہے، کہیں بھی کوئی مشاعرہ ہوتا، شعرا ان کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ علامہ تمنا عمادی اور ان کے تلامذہ کا قیام واقف کے یہاں ہی ہوتا تھا۔ بقول کامریڈ حبیب الرحمٰن:

> ''بلا مبالغہ ان کے دستر خوان پر روزانہ سینکڑوں لوگ ہوتے تھے، جس کے وہ چشم دید گواہ ہیں''۔

(ایک شام واقف کے نام۔ ۸۸/۱۰/۲۲، خدابخش لائبریری)

واقف کی دادیہال ہو، یا نانیہال ہر جگہ دینی، ملی، شعری وادبی سرگرمیاں ہمیشہ تیز سے تیز تر رہیں۔ ان کے خانوادے کے افراد قومی، سیاسی، سماجی نیز فلاحی ورفاہی کاموں میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ یہی وہ خوبیاں تھیں جو وراثت میں واقف میں بھی منتقل ہوئیں، چنانچہ ۱۹۳۴ء میں پھلواری شریف میں زلزلہ متاثرین کی بازآبادکاری کے لیے انہوں نے اپنی جیب خاص سے ایک خطیر رقم عنایت کی تھی۔

تحریک آزادی میں حصہ

ہندوستان کی تحریک آزادی میں واقف کے خانوادے اور خود، ان کی قربانیاں کسی دوسرے مجاہد آزادی سے کم نہیں رہیں۔ واقف برسوں روپوش رہ کر گاندھی جی کے مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ آزادئ وطن کے بعد انہوں نے کسی طرح کے وظیفے، یا مراعات کی دعویداری سے اجتناب کیا۔ ۱۹۴۶ء میں ریاست بہار میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں انہوں نے اپنی حکمت عملی سے آرا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد رکھنے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا، چنانچہ شہر میں ہر طرف امن وامان اور خیر سگالی کی فضا برقرار رہی؛ لیکن دوسرے مقامات پر بھڑکنے والے فساد کے شعلوں سے وہ بے حد مضطرب و پریشان رہتے تھے، لہٰذا:

> ''۱۹۴۶ء کے فرقہ وارانہ فساد کے موقع پر جب کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے بڑے بڑے لیڈران پٹنہ میں مقیم تھے۔ مسلم لیگ کے اکابر مثلاً خواجہ ناظم الدین اور سرفیروز

خاں کا قیام مسٹر یونس کے ساتھ گرینڈ ہوٹل میں تھا۔ کانگریس کے اکابر کچھ صداقت آشرم، کچھ ڈاک بنگلہ اور کچھ مختلف منسٹران کی کوٹھیوں میں ٹھہرے تھے۔ خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی ڈاک بنگلہ میں قیام پذیر تھے۔ مولانا سید محمود صاحب منسٹر کے ساتھ اسی کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے، جس میں آج کل گاندھی سنگراہلیہ کا دفتر ہے۔ جمعیۃ العلماء کا ایک وفد جس میں واقف صاحب، قاضی احمد حسین صاحب، حاجی عیسیٰ پھلواروی، حاجی شفیع پھلواروی شریک تھے، مولانا آزاد سے ملنے آیا تھا۔ اس وقت مولانا آزاد اکابرین کانگریس، یعنی راجندر پرساد، کرشن سنہا، انوگرہ نارائن سنگھ وغیرہ کے ساتھ کسی گفتگو میں منہمک تھے۔ مولانا کی مشغولیت دیکھ کر ارکانِ جمعیۃ نے واپسی کا پروگرام بنایا۔ واقف صاحب کہاں ماننے والے تھے، انہوں نے مولانا آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ حضرت! سورہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی کا شانِ نزول کیا ہے۔ مولانا آزاد اکابرین کانگریس کو چھوڑ کر واقف صاحب کی طرف مسکراتے ہوئے مخاطب ہوگئے اور دیر تک ان سے گفتگو کرتے رہے اور اس دوران کانگریس کے اکابرین ان دونوں کی گفتگو سنتے رہے''۔

('مضامین افضل'، ص:۱۱۴)

ایک اعلیٰ سطحی قومی وفد کو فرقہ وارانہ فساد کے تعلق سے جمعیۃ العلماء ہند کی تشویش گوش گزار کرنے میں واقف نے جس ذکاوت وذہانت کا ثبوت دیا، وہ ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ مخاطب کو متوجہ کرنے کا یہی منفرد انداز آگے چل کر ان کے اشعار میں نمایاں ہونے لگا، جس سے انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔

نشیب وفراز

اس میں شک نہیں کہ مختلف مسائل سے دوچار ہوتے ہوئے بھی واقف نے شہزادوں جیسا بچپن اور رئیس زادوں جیسی جوانی گزاری۔ ایام طفلی سے عہد شباب تک چمن میں بہار باقی تھی اور اقبال مندی کا ستارہ عروج پر تھا۔ گھر کیا تھا ایک مہمان خانہ تھا، جہاں آئے دن شعروسخن کی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں، آہ اور واہ کی گونج سن سن کر اساتذہ ہوں، یا شعرا، یا صاحب ذوق حضرات سب کشاں کشاں ان کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ ایک مشاعرہ ختم بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے کی بساط بچھنے لگتی۔ ضیافت کا

حال یہ تھا کہ دسترخوان کو اٹھانے کی نوبت آتی، نہ حقّے کی چلم ٹھنڈی ہو پاتیں ـــــ لیکن صبح آزادی کی پہلی کرن کے ساتھ واقف اپنے ہی اس شعر کے مصداق ہو گئے:۔

یہ امنگیں، یہ ترنگیں، یہ گلوں سے چھیڑ چھاڑ
فصل گل آئی تو عالم ہی نرالا ہوگیا

جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا ہے، ملک کی آزادی میں دوسرے محب وطن اور زمینداروں کی طرح واقف کے خاندان کی قربانیاں کسی دوسرے سے کم نہ تھیں، لیکن:

''۲۵ر ستمبر ۱۹۵۰ء کو زمینداری کے خاتمہ کے اعلان نے مسلم، اگروال اور کائستھ برادری کو بری طرح متاثر کیا۔ یہی تین برادری کے لوگ شعروادب سے منسلک تھے، چنانچہ شعروادب کی دنیا قدرے یخ بستہ ہو کر رہ گئی''۔

('آرہ: ایک شہر سخن'، ص: ۳۴)

چنانچہ صورتحال یہ تھی کہ:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اکثر مسلمان زمیندار خود کاشتکاری کا کام نہیں کرتے تھے۔ شعراوادبا کا طبقہ تو گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کرنے میں اس قدر منہمک و مصروف تھا کہ اپنی رعیت، بٹائی دار، کھیت کھلیان، زمین جائداد، ملکیت، حق جوت، آمدنی، خرچ اور لگان و جمع بندی جیسے اہم امور کو دیوان اور منشی جی پر چھوڑ کر یکسر لاتعلق تھا، جس کا لازمی نتیجہ ان کے اقتصادی و معاشی زوال کی شکل میں سامنے آیا۔ واقف نے اپنی بربادیوں کا پیش خیمہ بھی کچھ یوں بیان کیا ہے:

''شعروشاعری کے خبط اور موسیقی کے ذوق نے ہمیں تباہ کیا۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنی تھی، اس کی تیاری میں منہمک تھا، دیوان جی تشریف لائے اور خبر دی کہ سرکاری مال گزاری جمع کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ر دسمبر ہے اور اب صرف آٹھ یوم رہ گئے ہیں، ہم نے سنی ان سنی کردی، پھر کچھ دنوں بعد دیوان جی آئے اور کہا آج آخری تاریخ ہے کوئی صورت نکالیے، ورنہ جائداد نیلام ہو جائے گی اور واقعی نیلام ہوگئی۔

یہاں خوشی اس بات کی تھی کہ غزل مکمل ہوئی۔ رہی جائداد تو اس کی واگزاری کے لیے مقدمہ بازی شروع کر دی''۔

(''لطف ستم''، ص:۲۹-۲۸)

غربت کا آغاز

۱۹۴۷ء میں واقف کی عمر ۳۱ ربرس تھی۔ یہ سال جہاں ملک کے لیے ایک نیک فال تھا، وہیں ان کے زوال کا نقطہ آغاز بھی تھا، جو ۱۹۵۲ء کے آتے آتے ان کی زندگی کے لیے ایک نئی عبارت لکھ گیا۔ ۱۹۶۶ء سے تو ان کی دنیا ہی بدل گئی، یہاں تک کہ جو ہاتھ اشرفیاں اچھالتا تھا، وہ اپنے ہی اس شعر کی تضمین بن گیا:

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
سونے پیسے دیا کرتے ہیں سالانہ مجھے

اور حالات یہاں تک پہنچے کہ:

انشا جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

واقف کے زوال کی شروعات ہونے لگی، جو بتدریج بڑھتی ہی گئی اور جسے خود انہوں نے اپنی 'تدریجی غربت' اور ''آہستہ خرام افلاس'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان وجوہات میں ایک طرف ان کی آمدنی کا محدود اور کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جانا ہے تو دوسری جانب ان کی شاہ خرچی، بے جا مہمان نوازی کے ساتھ مقدمہ بازی کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ اگر چہ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی تمام دولت و جائداد انہیں کے حصہ میں آئی؛ لیکن بے جا اسراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کے بعد ایک مکانات، دکانیں، کھیت کھلیان و دیگر جائداد کے فروخت ہونے کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ارول سے لے کر آرا تک کی ملکیت ہاتھ سے نکلتی گئی۔ انجام کار شاہانہ ٹھاٹھ باٹ اور شان و شوکت دیکھتے ہی دیکھتے خزاں رسیدہ ہو گئیں۔ ذیل کے اقتباس سے اس دردناک صورتحال کی عکاسی ہوتی ہے:

''زمینداری کے کاموں سے اعراض اور مشاعروں سے جنون کی حد تک وابستگی نے پورے گھر کی بساط ہی الٹ کر رکھ دی۔ آہستہ آہستہ نوکر چاکر غائب ہونے لگے اور

قیمتی چیزیں اونے پونے فروخت ہونے لگیں۔ علامہ کی والدہ صفیہ خاتون ۱۹۶۶ء میں اس دارِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ اس کے بعد محلّہ چودھرانہ، آرا کا وہ مکان جس میں علامہ کا عہد طفولیت اور شباب گزرا تھا فروخت ہو گیا، آرا سے منتقلی اور پٹنہ میں واقع محلّہ گولک پور میں سکونت اختیار کر لی گئی''۔

('رازہائے درونِ پردہ'، ص:۲۱)

آرا سے پٹنہ مراجعت

واقف صرف چار سال کی عمر تک گہوارۂ مادری میں رہنے کے بعد ارول سے آرا چلے آئے۔ وہاں تقریباً پینتالیس سال کا عرصہ گزرتے گزرتے یہ سرزمین بھی ان پر اس حد تک تنگ ہونے لگی کہ انہیں والدہ کے انتقال کے بعد نقل مکانی پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ اسی سال وہ مع اہل وعیال گولک پور، پٹنہ میں اپنے برادر نسبتی عبدالسلام صاحب کے یہاں چلے آئے۔ کچھ دنوں تک وہاں قیام کے بعد پھلواری شریف میں نور عالم صاحب کے مکان موسوم بہ 'کمرہ' میں کرایہ پر رہنے لگے۔ کوئی ڈیڑھ سال کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ اہلیہ سمیت بال بچوں کو لے کر پھر آرا واپس ہوئے اور وہاں ملکی محلّہ میں ان کی رہائش کا بندوبست کر کے تن تنہا پٹنہ واپس ہوئے، جہاں ۱۹۹۳ء میں انتقال سے چند روز پہلے تک اس شہر کے چراغوں کو اپنے خونِ جگر سے روشن کرتے رہے۔ اگرچہ یہاں بھی ان کے قدردانوں اور عزیزوں کی کمی نہ تھی۔ سید شاہ مشتاق احمد اور اختر اورینوی تو ان کے قریب ترین رشتہ داروں میں ہی تھے۔ خانوادۂ خانقاہ منعمیہ قمریہ، میتن گھاٹ پٹنہ سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔ ہارون رشید، نسیم احمد ایڈوکیٹ (بعدہٗ جج) اور حکیم عفان نے ان کی ناز برداری میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھی۔ علاوہ ازیں ادارہ شرعیہ، سلطان گنج، خانقاہ مجیبیہ اور امارت شرعیہ، پھلواری شریف ان کے استقبال میں فرش راہ بنی تھیں؛ مگر انہوں نے اخباروں سے وابستگی اور اخباروں کے دفاتر کو ہی اپنے قیام کے لیے زیادہ موزوں سمجھا۔ پٹنہ منتقلی سے کوئی بیس سال قبل بھی ان کا رشتہ غیر منقسم ہندوستان کے صف اوّل کے رسائل وجرائد سے تھا، جن میں ''الکوثر''، ''ترجمان''، ''مسلمان''، ''الفقیہ''، ''ریاست''، ''انقلاب''، ''روزنامہ ہند'' وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن کی وہ قلمی معاونت کرتے تھے۔ ۱۹۶۶ء کے بعد ان کا رشتہ روزنامہ ''سنگم''، ''صدائے عام''، ''ہمارا نعرہ''، ''قومی تنظیم''، ''اتحاد وطن''، ہفتہ وار ''عظیم آباد ایکسپریس''، ''پندرہ روزہ مگدھ پنچ''، ماہنامہ ''المنعم''،

''زبان وادب'' وغیرہ سے تادم مرگ جاری رہا۔ بعد کے دنوں میں حق الخدمت کی بنیاد پر خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ کے لیے بھی انہوں نے گرانقدر قلمی معاونت کی۔ آرا کو دبستان عظیم آباد کی ہی توسیع سمجھنا چاہیے، جس کے نقوش واقف پر شروع سے ہی بڑے گہرے مرتب ہوئے تھے۔ خود وہاں کی شعری فضا کی دھوم سارے ہندوستان میں تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب واقف کی عمر پندرہ سال ہوئی تو انہیں فرنگی محل، لکھنؤ کے مذہبی، علمی وادبی نیز سیاسی ماحول سے استفادہ کا بھی موقع ملا، جس نے ان کی ذہانت وذکاوت کو جلا بخشنے میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔

علمی استعداد

واقف بچپن سے ہی انتہائی ذہین تھے، مطالعہ کا ذوق بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہیں مختلف زبانوں اور علوم وفنون پر کمال درجہ کا دسترس حاصل تھا۔ اردو، فارسی اور عربی زبان وادب پر غیر معمولی قدرت تھی ہی، انگریزی اور کسی حد تک ہندی زبان وادب سے آشنا تھے۔ قرآن واحادیث، تفسیر وفقہ اور تاریخ اسلام نصاب میں بھی پڑھی اور ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر ان کی شناوری بھی کی۔ تاریخ عالم پر بھی گہری نظر تھی۔ اپنے عہد کے مروجہ علوم میں فلسفہ، منطق، قواعد، عروض، علم جفر ورمل، نجوم، کیمیا، ہومیو پیتھک اور حکمت کے علاوہ عمرانیات، سیاسیات اور مختلف ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا تھا۔ موسیقی سے شغف ہی نہیں رکھتے تھے؛ بلکہ اس کی باریکیوں پر بھی گہری نگاہ تھی۔ مذکورہ موضوعات پر ان کی ذاتی لائبریری میں چھ ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں، جن کی فہرست سازی جناب ش م عارف ماہر آروی نے کی تھی۔ ان کی ذہانت قابل داد اور حافظہ قابل رشک تھا۔ حاضر دماغی اور بذلہ سنجی میں یکتائے روزگار تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی ایک شخص میں اتنی ساری خوبیوں کا بیک وقت جمع ہو جانا عجوبہ خلائق سے کم نہیں۔ شاعری میں اپنے وقت کے ممتاز استاد شاعر، حضرت تمنا عمادی پھلواروی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ بحیثیت شاعر خود کو سیماب، اصغر، جگر اور اقبال کی صفوں میں شمار کرتے تھے۔ اس وقت کے زمیندارانہ مزاج اور شان کے مطابق فن سپہ گری، گھڑسواری، تیراکی اور لاٹھی چلانے کا فن بھی اپنے عہد کے ماہرین سے سیکھا۔

عہد ماضی تو میرا بھولا ہوا افسانہ تھا

تغیرات زمانہ کے ساتھ واقف کی زندگی بڑے نشیب وفراز سے عبارت تھی، چنانچہ ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے شاندار ماضی کو بھی ذہن نشیں رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جہاں زمیندارانہ

ٹھاٹھ باٹ کے ساتھ شاہی طرز زندگی کی ساری آسائشیں موجود تھیں، وہیں جوانی کی دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہی یہ قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ زمانہ نے کروٹ بدلی تو نہ وہ تہذیب رہی نہ مذاق رہا اور نہ وہ معیار واقدار، یہاں تک کہ سیاست، معیشت ومعاشرت میں بھی زمین وآسمان کا فرق آچکا تھا۔ جس کی ضربیں بھی ان پر پڑیں ،مگران حالات میں بھی ان کی خودداری اپنی جگہ قائم رہی، جس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

کو اپنا شیوۂ حیات اور رہنمائے اصول بنالیا تھا اور انہیں پر ان کی زندگی آخری وقت تک گامزن رہی۔ مگر اس سختی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شخصیت اجتماع ضدین بن کر رہ گئی۔ ایک طرف بے حد خوش مزاجی تو دوسری جانب مزاج میں بلا کی گرمی، کبھی بے حد غضبناک اور جوش وجلال میں آپے سے باہر تو کبھی بے مثال معصومیت وانکساری، کبھی نہایت عالمانہ وفاضلانہ گفتگو تو کبھی مغلظات اور گالیوں کی ایسی بھرمار کہ پوری لغت مرتب ہوجائے، کبھی خوش لباسی کے ساتھ بال داڑھی سب نہایت قرینے سے بنے ہوئے تو کبھی کپڑے کے نام پر بے ڈول شیروانی، بے سمت ٹوپی اور پاؤں میں چپل جیسی کوئی چیز، البتہ دواچھا قلم ان کے پاس ضرور رہتا۔ کبھی کھانے میں انواع واقسام کی چیزیں تو کبھی کوئلے کی راکھ کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے۔ کبھی فصاحت وبلاغت کا دریا بہتا تو کبھی ان پر خاموشی کے پہرے ہوتے۔

واقف کی شخصیت کی تشکیل میں جن عوامل کی کارفرمائی تھی، ان میں ان کی بذلہ سنجی کے ساتھ طنز ومزاح اور ظرافت کو بڑا عمل دخل تھا، اسی کو حربہ بنا کر ایک زمانہ تک وہ اپنے شاندار ماضی کی کربنا کیوں کو بھلاتے رہے اور حالات کے خلاف سینہ سپر رہے۔ اسی نے انہیں طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ بھی دیا اور حالات پر ضرب لگانے کا عزم بھی بخشا۔ اسی کے ساتھ ان کا خداداد حافظہ، بلا کی ذہانت اور شگفتہ تحریریں، نیز فی البدیہہ اشعار ان کے رفیق وجلیس رہے۔ ان کی زندگی میں نہ جانے کیسے کیسے طوفان آئے ،مگر انہوں نے کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ خوشامد، چاپلوسی اور مصلحت جیسی چیزیں کبھی ان کا راستہ نہیں روک سکیں۔ جن امور نے انہیں متاثر کیا، ردعمل کے طور پر وہ ان کے قلم سے نکل کر صفحہ قرطاس کی زینت بنے۔ اپنے زمانہ میں حالات حاضرہ پر اتنی بے باکی اور جرأت مندی سے شاید ہی کسی شاعر نے تیشہ چلایا ہوگا جتنا واقف نے؛ کیوں کہ واقف کا ضمیر زندہ تھا۔

واقف کی دانشوری کا ایک زمانہ قائل ہے اور بلا شبہ ایسے نابغۂ روزگار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بظاہر کبھی کھوئے کھوئے، دنیا سے بیگانہ دکھائی دینے والے واقف کا ذہن ہر وقت بیدار رہتا تھا۔ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے فصاحت و بلاغت ہی نہیں علم کا دریا بہا دیتے۔ وہ علم کی ایک ایسی مشین تھے جو چند سکوں کے عوض کسی اخبار کے لیے ''واقف آرٹ'' یا ''شذرات واقف'' کے تحت خونِ جگر اگلتے تو اسی وقت کسی روزنامہ کے لیے اداریہ بھی سپردِ قلم کرتے۔ کسی کے لیے معمولی حق الخدمت پر ریڈیو ٹاک لکھتے تو کوئی سہرا اور رخصتی نامہ لکھوا کر لے جاتا اور کسی کی حمد و نعت کی فرمائش پوری ہوتی۔

اگر کسی کو کسی سے رنجش نکالنی، یا انتقام لینا ہوتا، وہ اپنی ضرورت کی تکمیل کے لیے ان سے رجوع کرتا۔ واقف کی نوک قلم سے بڑی بڑی ہستیوں کے بسمل ہونے کا تماشہ لوگوں نے تقریباً پچاسوں سال تک اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

واقف کی خداداد صلاحیتوں کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ کسی موضوع پر لکھتے ہوئے وہ اپنی تحریروں کو اشعار اور نثری حوالوں سے مزین کرتے تھے اور پوری صحت کے ساتھ کتاب کے اقتباس، اس کا صفحہ، سن اشاعت اور مطبع تک کا نام درج کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر انھوں نے اس زمانے میں لکھے، جب ان کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی اور برسوں سے کتاب پڑھنے کا انہیں موقع نہیں ملا تھا۔ ان کے ادبی و علمی مضامین کے حوالوں میں وہ رسائل و جرائد بھی قابل ذکر ہیں، جن کا تقریباً سارا مواد ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ کسی اخبار کا دفتر، لائبریری، یا ان کا کوئی اور مستقر ہو، ٹہلتے رہنا اور لکھتے رہنا۔ دن کے اوقات میں یہ چیزیں ان کی معمولات زندگی کا حصہ تھیں؛ مگر رات کے اپنے شباب پر آتے ہی ان پر ایک عجیب و غریب اضطرابی؛ بلکہ وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ وقت صرف ان کے لیے مخصوص تھا، اپنے رب سے سرگوشی کا، نالہ نیم شبی کا۔ ان کی پیٹھ بستر سے کم ہی لگتی تھی۔ وہ ٹہلتے رہتے، گنگناتے رہتے، کبھی آیاتِ الٰہی کبھی اوراد و وظائف، کبھی حمد و نعت و سلام تو کبھی گریہ، یہاں تک کہ اذانِ فجر ہو جاتی۔ ان کی اس کیفیت کا مشاہدہ واقف کے اس میزبان نے کیا ہوگا، جس کے نصیب میں ان کی شب گزاری کی سعادت آئی ہوگی۔

واقف کا قیام ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۳ء تک پٹنہ میں رہا، البتہ انتقال سے کچھ دن پہلے بیمار ہو کر کاکو چلے گئے، پھر وہاں سے پٹنہ آئے۔ وصال سے صرف دو دن قبل وہ آرا چلے گئے جہاں زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ جس عظیم آباد کو انہوں نے اپنے نام کا جز ولاینفک بنائے رکھا اور جس شہر میں ان کی ناقدری

ہوئی وہیں ان کی قدر ومنزلت میں بھی اہل شہر نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا اور ان کے مزاج کی تمام ناہمواریوں کے باوجود انہیں سر آنکھوں پر بٹھائے رہے۔ یہاں تک کہ جن اکابرین اور ذی اقتدار شخصیتوں کو انہوں نے اپنے قلم کا نشانہ بنایا، وہ بھی ان کی خیر خواہی کا دم بھرتے رہے۔ ایسی ہی ہستیوں میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی، ناظم امارت شرعیہ حضرت مولانا نظام الدین، ادارہ شرعیہ پھلواری شریف ودیگر عمائدین امارت کے علاوہ خانقاہ منعمیہ قمریہ کے سجادگان، خواجہ افضل امام (جن کے اپنے پھوپھا تمنا عمادی کے واقف شاگرد تھے)، شاہ مشتاق احمد، غلام سرور، ہارون رشید وغیرہ ان کی میزبانی ودلجوئی میں پیش پیش رہتے تھے۔ بہار کے دو گورنر یونس سلیم اور ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی بطور خاص ان کی دانشوری کے معترف اور قدردانوں میں تھے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار، سابق ڈائرکٹر خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ ان کی علمی حیثیتوں کے معترف تھے۔ ان کی قدردانی ہی کا نتیجہ تھا کہ گزشتہ نصف صدی کے زائد عرصہ سے واقف کے دل ودماغ میں جو مذہبی، تاریخی، سیاسی نیز علمی، ادبی وثقافتی سرمایہ محفوظ تھا اسے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں انہیں کامیابی ملی۔ ''نگارشاتِ واقف'' کے نام سے بارہ جلدوں پر مشتمل قلمی نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے شعبہ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ اسی لائبریری میں منعقد واقف کے اعزاز میں ''ایک شام واقف کے نام'' منعقدہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۸ء عابد رضا بیدار کے غیر معمولی پذیرائی کا مظہر ہے؛ لیکن بقول حفیظ بنارسی: یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے۔

کام وہ نوکِ قلم سے لیتا تھا شمشیر کا
اک زمانہ آج تک بسمل ہے اس کے تیر کا

خواجہ افضل امام کے مطابق:

> ''واقف صاحب کے قلم سے ارکانِ امارت شرعیہ بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ خاص کر منت اللہ رحمانی مرحوم، امیر امارت شرعیہ پھلواری شریف۔ ادھر حال یہ تھا کہ جب ناظم امارت شرعیہ مولانا سید نظام الدین صاحب کو واقف صاحب کے اہل وعیال کی فاقہ کشی کا حال معلوم ہوا تو ان کی کفالت کی صورت نکال دی، جب کہ انہیں (واقف صاحب) امارت شرعیہ کے تعاون کا حال معلوم ہوا تو بہت شرمندگی محسوس کی، ہجو نویسی کے ازالہ کے طور پر حضرت رحمانی کے انتقال پر ایک زوردار مرثیہ واقف نے لکھا تھا''۔

(مضامین افضل، ص: ۱۱۴-۱۱۵)

واقف اور روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ کے رشتوں کا ایک زمانہ شاہد ہے۔ انہوں نے اس اخبار کی ادارت بھی کی، اسی روزنامہ میں ان کی سب سے زیادہ تخلیقات بھی شائع ہوئیں۔ نہ جانے ان کی زندگی کے کتنے شب وروز دفتر ''سنگم'' لالہ زار منزل، سبزی باغ، پٹنہ میں گزرے۔ شہر و بیرون شہر کی کیسی کیسی ہستیاں یہاں ان کی قدم بوسی کو پہنچتیں، کتنے لوگ ان سے سہرا، رخصتی نامہ، تہنیتی نظمیں، تاریخ وفیات وغیرہ لکھواتے، بے شمار ریسرچ اسکالرس نے یہیں سے واقف سے تحقیقی مواد حاصل کیا اور نہ جانے کتنے ان کی فیاضی سے شاعر بن گئے۔ بقول واقف:

رہے ہم تو اپنا نہیں کوئی دعویٰ

ہیں موجود 'سنگم' کے سارے شمارے

گویا روزنامہ ''سنگم'' واقف کی رہائش گاہوں میں ایک رہائش گاہ تھی۔ یہی اخبار ان کے احساس وجذبات کا ترجمان اور سامانِ زیست تھا، جس کے خلاف زندگی بھر جو چاہا، بلا روک ٹوک لکھا۔ جب عملاً وہ ''سنگم'' کی ادارت سے دستبردار ہوگئے تو اسی اخبار میں ''واقف آرٹ'' کے نام سے اپنا کالم شروع کردیا۔ کسی کو انہیں روکنے ٹوکنے کی ہمت نہ تھی؛ کیوں کہ کوئی کچھ رہے، انہیں یہ احساس تھا کہ ''میں سید شاہ فضل امام واقف ہوں''۔ یہی احساس ان کی قوت تھی، جس نے انہیں پوری مضبوطی سے قائم رکھا تھا اور غلام سرور کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا تھا کہ:

''پچاس سالہ پبلک لائف میں جتنی گالیاں سنیں، ان میں علامہ واقف کی گالیاں آدھی ہیں۔ واقف مرحوم نے کہا تھا: جب میں آپ کو گالیاں دیتا ہوں تو اس کے عوض لوگ مجھے پیسہ دیتے ہیں، جب میں دوسروں کو گالیاں دیتا ہوں تو 'سنگم' مجھے پیسہ دیتا ہے۔ دراصل ان گالیوں میں علامہ کے لیے رزق کا سامان تھا''۔

('آبشار' کلکتہ، ۶/ اکتوبر ۲۰۰۶ء)

عابد رضا بیدار کے زمانہ میں جب واقف کا خدا بخش لائبریری آنا جانا رہا، بیدار صاحب کی ان پر خاص نظر رہی۔ لائبریری اسٹاف کو ہدایت تھی کہ وہ جہاں چاہیں بیٹھیں اور جن کتابوں سے استفادہ چاہیں انہیں فراہم کی جائیں۔ لائبریری کینٹین جو وہاں کے اسٹاف اور ریسرچ اسکالرز کے لیے مخصوص تھا واقف صاحب کو بھی اس سے استفادے کی سہولت حاصل تھی۔ انہیں دنوں وہ حق الخدمت کی بنیاد پر

''نگارشاتِ واقف'' کی تحریر وتصنیف میں مشغول تھے۔ ان کی فرمائش پر معاوضہ میں انہیں نئے نوٹ اور نئے سکے دیئے جاتے تھے؛ لیکن وہ بیدار صاحب کے بھی شاکی تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے مجھ سے کہا:

''جانتے ہو میرے بھائی! میرے شہر آرا کا ایک جاہل محرر بھی تین لائن کی حاضری لکھنے کا فی صفحہ دس روپے لیتا ہے اور ایک بے دروا ہے، جسے ہم اور یجنل تھاوٹ دیتے ہیں، وہ مجھے تین روپیہ بھیج دیتا ہے تو میں بھی کیا کر رہا ہوں بھائی؟ ایک صفحہ میں آٹھ دس سطر ہی دے رہا ہوں، وہ سمجھتا ہے کہ میں الو ہوں، جب کہ میں اسے الو بنا رہا ہوں۔''

واقف نے شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا ہو:

ہیں واقف لوگ میرے دل کی قیمت کیا ہے دس پیسے
گرانی میں بھی الفت کو گراں ہونا نہیں آتا

واقف کا کس نے کتنا استحصال کیا یہاں یہ زیر بحث نہیں، البتہ وہ اپنا استحصال کرنے میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ جس کی ایک وجہ ان کی تنک مزاجی کے ساتھ بے قراری اور بے اعتنائی کی کیفیت تھی ہی، دوسرے یہ کہ وہ جلدی کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے مخاطب اور محسن کے پشت در پشت حسب ونسب تک پہنچ جانے میں انہیں دیر نہیں لگتی تھی؛ اس لیے بھی منفعت بخش ادبی محفلوں میں ان کی تمام تر لیاقتوں کے باوجود ذمہ داران ان سے چشم پوشی کرتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی موجودگی سے کسی کی دانشوری کا بھرم نہ کھل جائے، اس کا بھی لوگوں کو اندیشہ رہتا تھا؛ اس لیے جب تک ان کی بینائی نے ساتھ دیا، وہ خود لکھتے رہے اور اس کے بعد املا کرا کر دل وجان کی دولت نہایت معمولی اجرت پر لٹاتے رہے۔ کمال یہ کہ وہ اپنے معاملے میں تو خود کفیل تھے ہی، گھر کے لیے بھی کچھ نہ کچھ بچا کر رکھ لیا کرتے تھے، جن لوگوں نے ان کے دستر خوان پر سینکڑوں کو دیکھا تھا، ان کی نگاہوں میں واقف کا شاندار ماضی ہوگا، اس خزاں رسیدہ بہار کی تصویر رضوان اللہ آروی نے کچھ یوں پیش کی ہے:

''بوٹا سا قد، خمیدہ کمر، سوچتی ہوئی اور خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں، لب تبسم آشنا، دنیا اور اہل دنیا سے بے نیاز، اپنی ذات میں گم، قلم بدست فاقہ مستی میں مست اور خود شناسی وخودنگری کا ایک خاموش پیکر، یہ تھے علامہ سید شاہ فضل امام واقف آروی''۔

('رازہائے درون پردہ'، ص:۳۲)

حسرت ویاس کا ایک اور نقش سید جاوید حسن نے اس طرح پیش کیا ہے:

''جن لوگوں نے علامہ کو آخری وقتوں میں قریب سے دیکھا ہے، وہ ان کی مزید چند خصوصیات کا اضافہ کرلیں گے، مثلاً: سر پر لازمی طور پر ٹوپی، ہونٹوں میں اکثر ہا بیڑی سگریٹ، جسم پر صاف کم، بیشتر میلا سا کرتا پائجامہ، پیروں میں ہوائی چپل، شانوں سے لٹکتا ہوا جھولا، جھولے میں دو چار نئے پرانے قلم، چند مڑے تڑے سادے، یا خود کے تحریر کردہ کاغذات اور ہاتھ میں چھڑی اور ہاں! جھولے، یا کرتے کی جیب میں راکھ، علامہ راکھ کیوں کھاتے تھے؟ یہ ایک معمہ ہے، کہیں وہ پیٹ کی بھوک راکھ بھر کر ہی نہیں بجھالیتے تھے''؟

('لطف ستم'، ص:۱۹)

وہ پتھر کوئلے کی راکھ کی قاشیں ہوٹلوں سے پیسے دے کر خریدتے تھے، جولب معشوق کی طرح ان سے تقریباً پچیس تیس سال تک لگی رہی۔ نہ جانے کیوں؟

واقف کا آخری سفر

وہ ہے قبر سخن واقف کی اس پر فاتحہ پڑھ لے

جہاں اردو کی چنگاری چراغاں کرتی جاتی ہے

۱۹۹۳ء کی بات ہے، واقف عظیم آبادی اپنی عمر کا آخری حصہ پروفیسر خواجہ افضل امام صاحب کے یہاں گذارنا چاہتے تھے۔ چند دن وہاں قیام کے بعد خانقاہ منعمیہ، میتن گھاٹ چلے آئے، پھر وہاں سے کہیں اور نکل گئے۔ بے قراری انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی رہی۔ اسی درمیان ایک دن اچانک خواجہ صاحب کے یہاں پہنچے۔ بہت ضعیف و ناتواں ہو چکے تھے۔ بصارت بھی جواب دے چکی تھی۔ فرمانے لگے:

''خواجہ صاحب! میں اپنی زندگی کی شام آپ ہی کے مکان پر گزارنا چاہتا ہوں۔ ہم نے کہا کہ بسر و چشم۔ واقف صاحب ہمارے والد کے ہم نام تو تھے ہی دونوں میں یارانہ بھی تھا، لہٰذا واقف صاحب کے ساتھ سلوک اور خدمت ہم کار ثواب سمجھ کر کرتے تھے''۔

('مضامین افضل'، ص:۱۲۰)

یہاں قیام کو چند دن ہی گزرے تھے کہ ان کے فرزند اکبر امام کاشف انہیں اپنی سسرال بی بی پور، کاکولے گئے، کچھ دن وہاں رہنے کے بعد عابد رضا بیدار سے ملنے پٹنہ آئے۔ اس درمیان پھر خواجہ صاحب کے یہاں ہی ٹھہرے۔ پہلے سے زیادہ ناتواں وکمزور ہو چکے تھے۔ اعضا بھی مضمحل ہو گئے تھے۔ زندگی بھر جس کی خودداری نے کسی سہارے کو گوارا نہیں کیا، اب اسے کروٹ بدلنے کے لیے بھی سہارے کی ضرورت تھی۔ یہاں چند روز قیام کے بعد ان کے صاحبزادے انہیں بی بی پور لے گئے۔ ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ اکبر امام کاشف انہیں دفتر ادارہ شرعیہ، سلطان گنج، پٹنہ لے آئے اور وہیں سے آرا کا قصد کیا۔ کسی طرح ایک رات گزری۔ دوسرے دن صبح ان کی روانگی ہونی تھی۔ کسی سواری سے جانے کے لائق نہیں رہ گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے ایمبولینس کا انتظام کر دیا۔ واقف کی روانگی کا وقت تھا۔ ایک بار انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے عظیم آباد اور اہل عظیم آباد کو جی بھر کے دیکھا۔ وہ بھی کچھ سمجھ رہے تھے اور انہیں الوداع کہنے والوں کو بھی ان کے اس سفر کی نزاکتوں کا احساس ہو چکا تھا۔ اس وقت خواجہ افضل امام صاحب ان کے بالکل قریب تھے، جنہوں نے ان کی جدائی کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

"ہم نے الوداع کہتے ہوئے مصافحہ کرنا چاہا، ان کی فرمائش ہوئی، خواجہ صاحب! کچھ شعر سنایئے۔ اپنی کمزوری، پیری اور پریشانی کے تمسخر کا کوئی جواب نہیں۔ ہم نے شفیع پھلواروی کا ایک شعر پڑھ کر ان کے حکم کی تعمیل کی:

سب دغا باز ہیں بچپن کہ جوانی ہو شفیع
عمر بھر ساتھ یہی دے گا بڑھاپا اپنا

واقف صاحب نے پھر فرمایا: ایک آخری خواہش رہ جاتی ہے، کہا: استاد مرحوم کا کچھ سنایئے، چنانچہ ایک قطعہ انہیں سنایا:

سہنے کو زمانے کا ستم بیٹھے ہیں
کھانے کو احباب کا غم بیٹھے ہیں
افسوس کہ جو ساتھ بیٹھنے والے تھے
سب اٹھ گئے اور ایک ہم بیٹھے ہیں

کہنے لگے خواجہ صاحب! اب ہم بھی اٹھ رہے ہیں، اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا"۔

افسوس ایک ایسا باغ و بہار شخص جو زندگی بھر کبھی چین سے نہیں بیٹھا۔ ایمبولینس میں بے بس پڑا تھا، اس کے ہاتھ سے راکھ کی پوٹلی اور کاغذ کی تھیلی پہلے ہی چھوٹ چکی تھی۔ قلم کاتب تقدیر کے حوالے کر بیٹھا تھا۔ رہے بس نام اللہ کا۔ اسے اٹھنے کا احساس ہو چکا تھا۔ 'ہم بھی اٹھنے والے ہیں'۔ خودداری نے آخر اظہار مدعا بھی کر دیا۔ 'دعاؤں میں یاد رکھیے گا'۔

۵/ستمبر ۱۹۹۳ء کی صبح ایمبولینس واقف کو پٹنہ سے لے کر آرا کی طرف چل پڑی۔ شام ڈھلنے سے پہلے سید شاہ نسیم الحق، گولہ محلہ، آرا کے یہاں پہنچے۔ وہاں صرف ایک رات گزار کر ۶/ستمبر ۱۹۹۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ (إنا للّٰه وإنا إليه راجعون) دوسرے دن ۷/ستمبر بعد نماز عصر اپنے نانیہالی قبرستان، منشا پانڈے کا باغ، آرا میں آسودہ خاک ہوئے:

لحد میں یہ فرشتوں نے کہا واقف مبارک ہو
کہ تم کلمہ سے جنت کی فضا لیتے ہوئے آئے



واقف: ایک درویش

واقف ایک صوفی تھے، ولی تھے، درویش تھے، قلندر تھے، بوریا نشیں فقیر تھے، قطب تھے، ابدال تھے، یا مجذوب ہو گئے تھے، یہ وہ سوالات ہیں، جو ہنوز جواب طلب ہیں۔ ان کی شخصیت اس قدر تہہ دار تھی، جس کی گرہ کشائی ان کی زندگی میں بھی ممکن نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ وہ اسے لیے ہوئے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے؛ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ایک صوفی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اپنے جدامجد شاہ سمن اروی پر انہوں نے ایک منقبت بھی لکھی ہے، جس میں ان سے اپنی نسبت ظاہر کی ہے۔ وہ پیرانِ پیر حضرت عبدالقادر جیلانی کو بھی اپنا جدامجد تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ ان کا کہنا ہے:

کرم واقف پہ ہے جد کریم شاہ جیلاں کا
سمجھتے ہیں مگر یاروں کی نادانی نہیں جاتی

انہیں صوفی خانوادوں کا فیض ہمیشہ حاصل رہا۔ ان کی رسم بسم اللہ پیر طریقت شمس العلما مولانا سید شاہ بدر الدین پھلواروی کے ذریعہ عمل میں آئی۔ سولہ سال سے کم کی عمر میں حضرت تمنا عمادی پھلواروی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوئے جب کہ سید شاہ امان اللہ قادری، سجادہ نشیں، خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ سے انہیں شرف بیعت حاصل ہوا۔ خانقاہ منعمیہ قمریہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سٹی سے عقیدت اور قرابت داری تھی۔ تصوف سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ سلسلہ قادریہ سے تو مرید تھے ہی، دیگر سلاسل سے بھی انہیں گہری عقیدت تھی۔ اپنی جسمانی ناتوانی کے باوجود ۱۹۸۳ء میں خواجہ

اجمیریؒ کی درگاہ پر حاضری دی اور وہیں ایک عقیدت مندانہ منقبت ''دربار خواجہ میں'' کہی؛ لیکن ان کے باطن کی دنیا کیا تھی، یہ وہ جانتے ہوں گے، یا ان کا خدا، البتہ ان کی ظاہری کیفیت کو دیکھتے ہوئے رضوان اللہ آروی نے ''علامہ واقف: ایک پراسرار شخصیت'' کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا، جس میں انہوں نے ان کی شخصیت کے اسرار و رموز سے پردہ کشائی کی کوشش کی ہے اور بعض حقائق کی جانب متوجہ بھی کیا ہے، جو اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ جاتے ہیں:

''کہتے ہیں کہ تصوف سے بھی ان کا یارانہ تھا اور انہوں نے سلسلہ طریقت میں بیعت بھی کی تھی؛ لیکن مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تصوف کی کون سی راہ پر گامزن تھے، بظاہر میں نے انہیں پنج وقتہ نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی وہ مصروف وظائف نظر آئے۔ ہاں اتنا ضرور دیکھا کہ وہ جو اہل دنیا کے سامنے تیغ آبدار تھے، جب ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک لیا جاتا تو وہ سراپا عجز و انکسار بن جاتے اور ان کی نگاہیں خلاؤں سے اتر کر زمین میں کچھ ڈھونڈنے لگتیں۔ تصوف کی وہ کون سی منزل تھی، میری سمجھ میں نہیں آیا...... علامہ واقف صوفی تھے، یا نہیں؟ یہ کہنا تو مشکل ہے؛ لیکن وہ پُراسرار ضرور تھے۔ اگر وہ پراسرار نہ ہوتے تو سب کچھ لٹنے: بلکہ لٹانے کے بعد بھی یوں مطمئن نہ ہوتے۔ یہ کیا اسرار تھا کہ ان کے چہرے پر حزن و یاس اور ملال کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ تھی، یہ کیا رمز تھا کہ وہ اطمینان کی دولت سے اب بھی مالا مال تھے''۔

('زبان و ادب'، پٹنہ جلد ۲۲ شمارہ ۲-۱، ۱۹۹۶ء، ص: ۵۶-۵۷)

واقف کی شخصیت کے حوالے سے ان کے دو شعر بھی بہت کچھ بتاتے ہیں، جو انہوں نے عین عالم جوانی میں کہے تھے:

چراغِ کشتۂ بزم محبت ہوں میں اے واقف
فروزاں عمر بھر رہنا ہے مجھ کو سوزش دل سے

کام آئیں ہر جگہ زیست کی ناکامیاں
ہر قدم پر رہنما بنتی گئی مشکل مجھے

واقف نے خوشحالی کا دور ایک چھوٹے سے شہر آرا میں گزارا۔ جب وہاں کی سرزمین ان پر تنگ ہوئی تو وہ پٹنہ چلے آئے، جسے شروع سے مرکزیت حاصل رہی۔ میر کو دلی کے پے در پے حملوں نے برباد کیا

اورانہوں نے لکھنؤ کا رخ کیا تو آصف الدولہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا، دوسو روپے اور بعض تذکرے کے مطابق تین سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا، یہاں انہوں نے مورنامہ، دربیانِ مرغ بازاں، دربیان ہولی وشکارنامہ جیسی نظمیں لکھیں۔ آرا میں واقف کو مشاعروں نے برباد کیا تو وہ پٹنہ میں گزربسر کے مواقع ڈھونڈنے لگے اوراس اخبار سے اپنی قسمت وابستہ کی جو ہمیشہ سرکاری عتاب کا شکار ہوتا رہا۔ ایڈیٹر روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ غلام سرور کبھی جیل میں تو کبھی جلسہ گاہ میں۔ ان پر حکومت مخالف رویہ کے الزامات میں بے شمار مقدمات چل رہے تھے اور غلام سرور چھ بار جیل جا چکے تھے۔ واقف کی جب جائداد نکلی تو ان کی خودداری اور انا نے انہیں بڑھ کر سہارا دیا۔ شاید اسی نفسیات نے انہیں واقف آروی سے سید شاہ علامہ فضل امام واقف ارولی، آروی ثم عظیم آبادی بنادیا۔ ان کے احساس نفس، تعین ذات اور تحفظ شخصیت کے لیے ان کی زندگی کے آخری لمحہ تک یہ ان کے نام کا ایک اٹوٹ حصہ بن کر رہا؛ تاکہ ایک طرف خانوادہ شاہ سمّن ارولی کے چشم وچراغ کی لاج بھی رہے اور معروف چودھری خاندان کی عزت پر بھی کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

واقف کے یہاں فلسفیانہ وحکیمانہ تصورات، توکل وقناعت، استغنا وسیع المشربی، انسان دوستی ودردمندی، دل سوزی وصبر وتحمل اوران کے کلام میں پائی جانے والی شیرینی ولطافت دراصل ان کی تصوف پسندی ہی کا کرشمہ ہے۔ وہ صبر وشکر کی دولت سے بھی مالا مال تھے، جسے ان کی بے نیازی اور قلندری نے مزید استقامت بخشی۔ وہ کبھی نہ کسی کے آگے جھکے اور نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا۔ وہ حالات کی ستم ظریفیوں کے خواہ کتنے ہی شکار ہوں، مصائب نے انہیں کس قدر کیوں نہ گھیر رکھا ہو، ان کی زبان پر کبھی حرف شکایت نہیں آیا۔ نہ کسی سے گلہ، نہ کسی کا شکوہ، نہ حالات کی ستم ظریفیوں کا ماتم، نہ غم روزگار کا رونا۔ وہ توکل علی اللہ کے عملی مظہر بنے رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو بھی مختصر ترین کر رکھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو کمبل، جسم پر پڑے ہوئے کپڑے، پیر میں چپل نام کی کوئی چیز، جیب میں دو قلم، ہاتھ میں ایک دو پالی تھین کے پیکٹ، ایک کاغذات کے لیے دوسرا کوئلے کی راکھ کے لیے ـــــــ کہیں یہ راکھ ان کی زندگی کا استعارہ تو نہیں، جسے وہ زندگی کے آخری زمانے میں پچیس تیس برسوں تک اپنے ساتھ ڈھوتے رہے، کھاتے رہے، یہ تنہائی میں بھی ان کے ساتھ رہتی اور مجلسوں میں بھی؛ مگر ان کی آنکھوں میں جلال وجمال کے ساتھ ایسی چمک کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سبھوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ ان کی معنی خیز ''ہوں'' اور طنز آمیز مسکراہٹ کا سراغ لگانا بھی انتہائی مشکل تھا۔ خوشحالی کے دور میں ان کی سخاوت وفیاضی کے چرچے تو عام ہیں، افلاس وتنگدستی کا بھی یہ عالم کہ بقول کامریڈ حبیب الرحمٰن:

"کوئی فقیر علامہ واقف کے سامنے ہاتھ پھیلائے، یہ ناممکن کہ وہ خالی ہاتھ واپس چلا جائے، خاص کر پہلا فقیر۔ ایک بار اخبار کے دفتر سے انہیں دس روپے ملے، جیسے ہی باہر آئے، ایک فقیر نے ہاتھ پھیلا دیا، انہوں نے جیب سے دس روپے نکالے اور فقیر سے کہا کہ یہی دس رُوپے ملے ہیں، آدھا تمہارا، آدھا ہمارا، اور انہوں نے پانچ روپے فقیر کو دے دیے اور کہا جب تک میری جیب میں پیسہ ہے میں پیسے کی توہین نہیں کروں گا۔"

ویسے بھی وہ جس رکشے کی سواری کرتے، اجرت کے علاوہ بھی اسے بخشش ضرور دیتے، جس ہوٹل میں کھانا کھاتے، یا اشیائے خوردنی لیتے، قیمت کے ساتھ بیرے کو بھی کچھ عنایت کرتے۔ خواجہ افضل امام نے ایک رکشہ والے سے ان کے سلوک کا ایک دلچسپ واقعہ رقم کیا ہے:

"نہ بت خانوں میں نام اس کا نہ کعبہ میں نشاں اس کا
بتاؤ جنس الفت ظالمو! آخر کہاں رکھ دی

اب اس شعر کی توضیح سنئے! موصوف رکشہ پر ہمارے یہاں تشریف لائے، رکشہ سے اترے، کرایہ ادا کیا، پھر یہ کہتے ہوئے رکشہ پر سوار ہو گئے کہ رکشہ والا نیا آدمی ہے، راستہ بھٹک جائے گا، اسے سڑک تک پہنچا کر خراماں خراماں واپس چلے آئے۔ اب اس واقعہ کو قاری اپنے ذوق کے مطابق جنس الفت کی تلاش پر محمول کرے، یا ان کے جذبہ جنوں پر"۔

('مضامین افضل'، ص: ۱۱۷)

تو یہ تھے واقف کی پراسرار شخصیت کے چند مزید پہلو۔ ان کے بارے میں ایک عام مشاہدہ یہ بھی تھا کہ وہ بڑے میلے کچیلے رہتے تھے، غسل کا اہتمام بہ تکلف کبھی کرتے ہوں گے، پھر بھی ان کے جسم سے کبھی بو نہیں؛ بلکہ ایک خاص قسم کی خوشبو آتی تھی، جس کی طرف ایڈیٹر "سنگم" نے بھی مجھے کئی بار متوجہ کیا تھا، اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کریں، گرچہ انہوں نے اپنے حزنیہ کلام کو بھی نشاط غم سے مرصع کیا ہے؛ لیکن ان میں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں، جو ان کی شخصیت کو آئینہ دکھاتے ہیں اور ہمیں ان کے اندرون میں جھانکنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں:

یہ آبگینہ دل وقف ضرب پیہم ہے
نفس کی آمد و شد زندگی کا ماتم ہے
ستم ظریف ہے کتنا جمال فطرت بھی
بہار خندہ گل، فیض اشک شبنم ہے

جواب نغمہ چنگ و رباب ہے واقف
شکست دل کی جو آواز آج مدھم ہے

وہ ہمیشہ ایک بات کو بہت زور دے کر کہا کرتے تھے:

''میری پہلی وفاداری اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے''۔

شاید اسی احساس نے ان سے یہ شعر بھی کہلایا:

پیام عمل ہے یہی ہر ولی کا
عبادت خدا کی ، اطاعت نبیؐ کی

واقف کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں نے ان کی زندگی کے بعض ایسے مخفی پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جن سے ان کی ''پراسرار شخصیت'' کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس سلسلے کا ایک واقعہ ملاحظہ کیجیے:

''۱۹۷۵ء میں جب وہ (واقف) ان (پروفیسر مرتاض الدین، داناپور) کے مکان پر گئے تو فرمایا کہ لاؤ کاغذ اور قلم، ایک دعا لکھ لو۔ یہ دعا تمہیں سیلاب سے محفوظ رکھے گی۔ پروفیسر صاحب پس وپیش میں پڑ گئے۔ اس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ پٹنہ میں ہلاکت خیز سیلاب بھی آئے گا...... عین ایک ہفتہ کے بعد پٹنہ میں سیلاب کا پانی چڑھ آیا۔ پروفیسر صاحب کے گھر کی چار سیڑھیاں زیر آب ہوگئیں، پانی کمروں میں داخل ہونے کو تھا کہ انہیں علامہ کی وہ دعا یاد آ گئی اور انہوں نے دعا پڑھنی شروع کی۔ اللہ کی شان یہ ہوئی کہ رات سے پانی اترنا شروع ہو گیا''۔

('مقالات نو'، ڈاکٹر مظاہر الحق، ص: ۸۳-۸۲)

ان کی ایک بات جو رہ رہ کر مجھے یاد آتی ہے:

''۱۹۸۴ء جون جولائی کا مہینہ ہوگا، واقف عظیم آبادی دفتر 'سنگم' میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے کن انکھیوں سے دیکھا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: 'مجھے دلی لے چلو' میں نے عرض کیا، دہلی جا کر کیا کریں گے، آپ کی صحت بھی اس کی متحمل نہیں'۔ قدرے غضبناک لہجے میں: 'مجھ سے سوال جواب مت کرو ہوا، اپنی حد میں رہو'۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اچانک سے نرم پڑ گئے۔ بچوں جیسی معصومیت ان کے چہرے پر عود کر آئی۔ کہنے لگے: 'جانتے ہو میرے بھائی، تمہاری پیشانی پر داغ یتیمی دیکھ رہا ہوں؛ اسی لیے بتا دے رہا ہوں، مجھے اندرا گاندھی سے ملنا ہے'۔ میں نے حیرت واستعجاب کے مارے درمیان میں ہی مداخلت کر دی.... 'کس لیے؟' بولے: 'میں راجیو گاندھی کی

بادشاہت پر غور کر رہا ہوں'۔ بظاہر یہ کچھ عجیب سا جواب تھا؛ لیکن دنیا نے دیکھا کہ قدرت کو بھی یہی منظور تھا۔ میرے ذاتی مشاہدے میں ایسے اور بھی کئی واقعات آئے ہیں''۔

عبدالغفور صاحب ۷۵-۱۹۷۳ء میں بہار کے وزیر اعلیٰ تھے، وہ واقف صاحب کے عقیدت مندوں میں تھے۔ اکثر و بیشتر ان سے سلوک کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے۔ دسمبر کی کسی تاریخ کو ایک دن واقف صاحب ان سے ملنے ان کی سرکاری رہائش گاہ پہنچے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ''واقف آرٹ'' جو ان دنوں کانگریس کے گلے پر چھری کی طرح چل رہی تھی، اس کا بھی ذکر نکلا۔ غفور صاحب ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بات کرتے کرتے رات ہوگئی۔ ان کی واپسی پر وزیر اعلیٰ نے انہیں دو قیمتی کمبل کا تحفہ پیش کیا، جس کے وزن کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ والے آدمی نے کمبلوں کو سنبھال کر رکھ لیا۔ دونوں ساتھ ساتھ باہر نکلے۔ انہیں ''سنگم'' کے دفتر آنا تھا۔ وزیر اعلیٰ کی کوٹھی سے دو ڈھائی میل کی مسافت طے کی ہوگی کہ راستے میں انہیں دو فقیر نظر آئے، جو سردیوں سے ٹھٹھرے فٹ پاتھ پر پڑے تھے۔ واقف صاحب کی نظریں ان پر جا پڑیں۔ انہوں نے دونوں فقیروں کے جسموں پر ایک ایک کمبل ڈلوا دیا اور آگے کی راہ لی۔ ان کے ساتھی کو ان کے اس عمل پر حیرت بھی ہوئی اور جھنجھلاہٹ بھی: ''یہ آپ نے کیا کیا؟ کون سی عقلمندی ہوئی؟'' واقف صاحب نے بڑے پُرسکون لہجے میں جواب دیا: ''انہیں کوئی نہیں دے گا، مجھے اللہ دے دے گا۔'' ابھی دفتر ''سنگم'' پہنچے بھی نہیں تھے کہ ایک دوسرے صاحب نے انہیں ایک نئی گرم شال عنایت کر دی۔ بیشک رزّاق پر ان کا بھروسہ بڑا گہرا تھا۔ کیا درست کہا تھا جاوید اشرف نے:

فقیری میں فقیروں کی تواضع کون کرتا ہے
یہ درویشی نظر آئے گی جنت میں جواں ہو کر

حضرت ذوالنون مصریؒ نے صوفی کی تعریف کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''صوفی وہ ہے جسے جستجو تھکا نہ سکے اور محرومی بے چین نہ کر سکے''۔

اس طرح علی بن عثمان ہجویری ''کشف المحجوب'' میں لکھتے ہیں:

''صوفی وہ ہے جو اپنے وجود سے فانی ہو کر باقی بحق ہو جائے اور اپنے مزاج اور طبیعت کی قید سے آزادی حاصل کر کے راضی برضا ہو جائے''۔

واقف کی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے اگر تصوف کی مندرجہ بالا تعریف کو متحضر رکھیں تو پھر ان کی شخصیت کے اسرار خود بخود کھل جاتے ہیں۔

آرا کا شعری پس منظر

عہد قدیم سے ہی ہندوستان میں آرا کو تہذیبی و تمدنی، نیز تاریخی و سیاسی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تقریباً چار سو سال سے یہ شہر علم و ادب اور شعر و سخن کا ایک عظیم الشان گہوارہ رہا ہے، جس کی نشو و نما میں یہاں کی گنگا جمنی روایت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ آرا میں اردو شاعری کی ابتدا شاہ عالم ثانی کے عہد سے ہو چکی تھی۔ یہاں سے سمت مغرب تقریباً تیس کیلو میٹر دور کے فاصلے پر ''سرائے بنارس'' نامی بستی میں ایک بزرگ شاہ کمال قادری اپنے مریدوں کو رشد و ہدایت فرمایا کرتے تھے۔ ان کے مریدوں میں مرزا عبدالخالق اور ان کے بھائی مرزا قلندر بھی تھے، جو اپنے شیخ کے یہاں رہ کر ان کی خدمت پر مامور تھے۔ وہیں ۱۶۴۶ء میں عبدالخالق کے یہاں ایک فرزند تولد ہوا، جس نے آگے چل کر دنیائے سخن میں مرزا عبدالقادر بیدل کے نام سے شہرت حاصل کی۔ عبدالخالق کے انتقال کے بعد پیر نے ہی عبدالقادر کی پرورش و پرداخت کی۔ قیاس اغلب ہے کہ ۲۸ سال کی عمر میں ۱۶۷۴ء میں تلاش معاش میں وہ دہلی پہنچے، جہاں محمد اعظم شاہ خلف اورنگ زیب کے یہاں ملازمت اختیار کر لی۔ انہیں شعر و سخن سے بھی شغف تھا۔ میر تقی میر نے ''نکات الشعرا'' میں ان کا یہ شعر درج کیا ہے:

شہرۂ حسن سے از بس کہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

ان کی مکمل غزل اردو تذکروں کی دوسری کتابوں میں موجود ہے۔ بیدل کو آروی مانتے ہوئے

آرا میں اردو شاعری کی ابتداء ۱۶۴۶ء کے آس پاس ہوتی ہے، مگر ان کی جائے پیدائش متنازعہ ہے۔ اگر بیدل آروی نہ بھی ہوں تو ان کی ولادت کے برسوں بعد میر سید خورشید علی خورشید بلگرامی ۶ ستمبر ۱۷۴۶ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے، اس اعتبار سے خورشید بلگرامی کو ہی آرا میں شاعری کا نقطہ آغاز سمجھا جائے تو یہی عہد میر و سوداؔ کا بھی تھا۔ خورشید بلگرامی کے معاصرین میں آرا میں لالہ جگر ناتھ سنگھ مخدوم جیسے قادر الکلام شاعر بھی تھے، جن کی مثنوی ''قصہ است کنور'' اس عہد کی اردو زبان کا نمونہ ہے۔

قدیم صوبہ بہار (بشمول بنگال، آسام اور اڑیسہ) میں صوبیداری تھی، جو بنگال کے ماتحت تھی۔ فرخ سیر کے زمانہ میں یہاں نظامت قائم ہوئی، جس کی باگ ڈور نواب علی وردی خاں کے ہاتھوں تھی، جسے انہوں نے زین العابدین خان ہیبت جنگ کے سپرد کر دیا، جو اُن کے داماد اور بھتیجا تھے۔ اس زمانہ میں ہیبت جنگ کے ہم زلف ہدایت علی خان فوج کے بخشی ہوئے اور لالہ جانکی رام نائب صوبیدار عظیم آباد مامور ہوئے۔ وہ امور سلطنت کی انجام دہی کے ساتھ شعر و سخن میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ لالہ جانکی رام کے بعد راجہ رام نرائن موزوں نائب صوبیدار ہوئے، جن کا مشہور شعر آج بھی زبان زد عام ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

ایک زمانہ تک مختلف تاریخی و سیاسی نشیب و فراز سے گزرتا ہوا ۱۹۷۲ء تک ریاست بہار کا شاہ آباد قائم رہا، پھر یہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، روہتاس کا صدر مقام سہسرام اور بھوجپور کا آرا ہوا۔ یہ پہلے بھی شاہ آباد کا صدر مقام تھا۔ سہسرام کو زمانہ قدیم سے شعر و سخن کی آماجگاہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور آج بھی یہاں شعر و ادب کی ترقی و ترویج جاری ہے۔ خواجہ میر درد کے دیوان کی اوّلین اشاعت مطبع کبیریہ، سہسرام سے ہی ہوئی تھی۔ آرا کے اس عہد زرّیں میں مسلمانوں کے علاوہ اگروال اور کائستھ گھرانوں کی بھی شعری و ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ آرا کو یہ بھی امتیاز رہا کہ یہاں صفیر بلگرامی، سریر کابری، بدر آروی، طبیب آروی، تمنا عمادی، ثاقب عظیم آبادی، شمس عظیم آبادی، زار عظیم آبادی، وحشت کلکتوی کے علاوہ نوح ناروی کے شاگرد تو تھے ہی راسخ، غالب، مصحفی، شمشاد اور سیماب کے تلامذہ بھی شعر و سخن میں پیش پیش تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیسے کیسے نامور اساتذۂ سخن کے دم سے آرا کی ادبی محفل آباد تھی اور مذکورہ اساتذہ کے شاگردان بھی یہاں ماہ و انجم کی طرح چمک رہے تھے۔

غدر (۱۸۵۷ء) کے زمانہ سے آرا میں شعری و ادبی انجمنوں کی تشکیل اور شعرا کے کلام کے

گلدستوں کی اشاعت کی سند بھی ملتی ہے۔ جس سے وہاں سخن شناسی اور سخنوری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ اس دور میں خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی کی شادی آرا میں ہوئی اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ یہاں کا ادبی و شعری احوال انہوں نے ''داستانِ سخن'' میں لکھا ہے۔ یہ غالباً ۱۸۶۰ء کی تصنیف ہے۔ انہوں نے ''انجمن احباب'' کے نام سے ایک بزم بھی قائم کی تھی۔ صفیر بلگرامی، افضل آروی، باقر آروی، حکیم لقمان حیدر، سلیم آروی، منشی بالک رام، منشی کیرت نارائن شوکت، منشی رگھوویر دیال وغیرہ انجمن کے ماہانہ مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ آرا میں مشاعروں کی روایت کو فروغ دینے والوں میں امیر حسن بدر آروی (۱۹۳۰ء/۱۸۷۵ء) کی غیر معمولی خدمات ہیں۔ اس زمانہ میں انہوں نے بڑے پیمانے پر مشاعرے بھی کروائے۔ یہاں تک کہ آرہ کی گلی گلی، قریہ قریہ اور گاؤں گاؤں سخن وری کا شہرہ ہو گیا اور شاید ہی کوئی ایسا گھر بچا ہو جہاں شاعر نہ ہو۔ بدر آروی کے معاصرین میں وجد آروی، قیس آروی، منشی لال بہاری لال اصغر، منشی رگھوناتھ نسبت، صفی آروی، نندکشور جوہر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اسی دور میں وہاں محمد احسن مارہروی، رضا علی وحشت کلکتوی، عشرت لکھنوی، نوح ناروی اور جگر مرادآبادی جیسے شاعروں کی بھی دھوم تھی۔ بدر آروی نے ایک سہ روزہ یادگار مشاعرہ کلہڑیا ہاؤس، آرا میں کرایا تھا، جس کے دعوت نامہ کی خوبی یہ تھی کہ وہ منظوم تھا اور اسی میں طرحی مصرعہ بھی تھا:

سر جھکا ہو، پائے قاتل پر جھکی تلوار ہو

سائل دہلوی، احسن مارہروی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، جگر مرادآبادی، نوح ناروی جیسے شاہانِ سخن نے بھی اس مشاعرے میں شرکت کی تھی۔ مشاعرے میں نوح ناروی کے اس قطعہ کی دھوم تھی اور اس حوالے سے بھی آرا کی شہرت رہی:

کشتی لیے دریا کے کنارے آئے　　کہتے ہیں کہ پیارے مرے پیارے آئے
اللہ اللہ رے کشش حضرت بدر　　نارے سے چلے نوح تو آرے آئے

اس مشاعرہ کے محرک سید حامد حسین حامد، سجادہ نشیں، درگاہ شاہ ارزواں، پٹنہ تھے، جو خود بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ آرا کی شاعری کو پروان چڑھانے میں ولی حیدر گہر آروی ابن صفیر بلگرامی تلمیذ بدر آروی کے علاوہ مختلف انجمنوں، شعری گلدستوں اور طرحی مشاعروں کی روایات نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ گہر نے ۱۹۲۹ء میں ''بزم ادب'' کی بنیاد ڈالی، جس کے تحت پابندی سے ماہانہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ اس میں بدر کے شاگردوں میں نطق، وجد، قیس، قمر وغیرہ طرحی غزلوں کے ساتھ شریک مشاعرہ ہوتے

تھے۔''شاہ آباد اردو لائبریری'' آرا کے سالانہ جلسے کے طرحی مشاعرے کی شہرت آرا سے باہر بھی تھی۔اس مشاعرے میں شنکر دیال فتنہ، ولی حیدر گہر، وحید مرزاپوری، امیر آروی، نصرت آروی، قمر کھتاری، جوہر نظامی اور علامہ فضل امام واقف جیسے قادر الکلام شعرا پابندی کے ساتھ شریک ہوتے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔اسی زمانے میں ''آوارگانِ ادب'' آرا جس کا نام بعد میں ''وارفتگانِ ادب'' آرا ہو گیا، جس کی سرپرستی نصرت آروی فرمارہے تھے۔''تحفہ ادب شاہ آباد، آرا'' اسی لائبریری کے طرحی مشاعروں کا گلدستہ ہے۔''وارفتگانِ ادب'' آرا کا ہفتہ وار مشاعرہ تو ہوتا ہی تھا، عید، ہولی اور دوسرے تہواروں پر ہونے والے مشاعروں کے لیے بھی یہ مشہور تھا۔یہ سلسلہ ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۰ء تک نیر آروی کی سرپرستی میں ایک شعری انجمن فعال رہی۔آزادی کے فوراً بعد ۱۹۴۸ء میں ش م عارف ماہر آروی نے ''گہوارۂ ادب'' کی بنیاد ڈالی۔۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء تک ''بزم ثقافت'' بھی کافی سرگرم رہی۔سید شاہ فضل امام واقف آروی کا دولت کدہ واقع محلہ چودھرانہ بھی ایک زمانہ تک شعر وسخن کی آماجگاہ رہا۔ان کے یہاں منعقدہ مشاعروں کی صدارت عام طور پر ان کے استاد حضرت تمنا عمادی پھلواروی فرماتے تھے۔۱۹۳۴ء میں واقف کے یہاں منعقدہ ایک یادگار طرحی مشاعرہ میں معزالدین جادو کا یہ شعر سر چڑھ کر جادو کی طرح بول رہا تھا:

ہر گل اندام چڑھا جاتا ہے دو پھول ضرور
قبر عشاق کی گل پوش ہوئی جاتی ہے

واقف کی غیر مطبوعہ تحریروں میں، جو ''نگارشات واقف'' کے نام سے خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں، ان میں ایسے دیگر مشاعروں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ان کے وہ مشاعرے بھی کافی مقبول ہوئے جو دوسرے مقامات پر منعقد کئے گئے تھے۔۱۹۳۲ء میں انہوں نے چودھری محمد اکرام الدین حباب کی نشست گاہ جو ''بیٹھک'' کہلاتی تھی، وہاں تمنا عمادی کی صدارت میں ایک مشاعرہ کرایا تھا، جس کی طرح تھی ۔

وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے

حباب پہلے حالی کے شاگرد تھے۔بعد میں انہوں نے قیس آروی سے مشورۂ سخن لیا۔واقف آروی کے معاصرین میں نورنوحی، ارمان آروی، رادھارمن بہاری حسرت، عباس بلگرامی، مظہر بلگرامی، باقر حسین، چودھری محبوب عالم، چودھری مجیب رضا، حسنین اشک، ماہ منیر خاں سہسرامی، نورالدین پیکر، حبیب آروی، محمد کلیم، حکیم سہسرامی وغیرہ کی گونج نہ صرف آرا؛ بلکہ پورے بہار میں سنائی دے رہی تھی، آج بھی ان کے ذکر کے بغیر بہار میں اردو شاعری کا کوئی تذکرہ نگاہ اعتبار حاصل نہیں کرسکتا ہے۔

واقف بحیثیت شاعر

(الف) غزل گوئی

شعر وسخن سید شاہ فضل امام واقف کا خاندانی اور موروثی ترکہ تھا ہی قدرت نے بھی انہیں ذہن رسا اور موزونی طبع کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ ان کی طبیعت سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اس وقت آرا میں کیا ہندو؟ کیا مسلمان؟ ہر طرف شعر وشاعری اور مشاعروں کا دور دورہ تھا۔ بقول واقف:

> ''میری زندگی کا آغاز شاعری کے ماحول میں ہوا اور قدیم آرا شاعری کے لیے مشہور تھا۔ آج جدید آرا تو بالکل پٹنہ ہے، عظیم آباد ہے، اس کا رنگ ہی الگ ہے، ورنہ ہمارے یہاں تو سات سو شعرا تھے اور کسی شاعر کو اپنی ہانڈی کی فکر نہیں تھی، فکر تھی کہ آج کے مشاعرے کی غزل کیسی ہوگی، گریباں کا قافیہ کیسے لکھا جائے گا، وہاں کسی آدمی کا شاعر ہونا کسی تعجب کی بات نہیں، شاعر نہ ہونا تعجب کی بات تھی تو یہ ماحول تھا اور بیت بازی کی مجلسیں وہاں ہر گھر میں ہوتی تھیں، اس میں کائستھ بھائی بھی شریک ہوتے تھے اور بیت بازی کے لیے ہم لوگوں کو ہزار دو ہزار اشعار یاد کرنے پڑتے تھے، یہ ساری باتیں مل ملا کر مجھ کو شاعر بنا رہی تھیں؛ مگر میں نے اب تک کوئی شعر نہیں کہا تھا، اتفاقی طور پر ایک خصی نے بکری کو سینگ مار دیا اور بکری نے جوابی حملہ کیا اور میں نے برجستہ یہ کہا:

اگر بکرا مارے گا بکری کو سینگ
تو بکری بھی مارے گی بکرے کو سینگ

یہ میرا پہلا شعر تھا''۔

('ایک شام واقف کے نام'، خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ ۲۲/اکتوبر ۱۹۸۸ء)

اس وقت واقف کی عمر کیا رہی ہوگی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا؛ لیکن سولہ سال کی عمر سے ہی انہوں نے اپنے گھر پر مشاعرے منعقد کرانے شروع کردیے تھے، اس کے علاوہ اپنے احباب اور بزرگوں کے یہاں بھی شعری محفلوں کا انعقاد کراتے تھے۔ ۱۸ سال کے ہوتے ہوتے ان کے کلام نے بڑے بڑے اساتذہ سخن کو متوجہ کرنا شروع کردیا تھا۔ ۳۰/اگست ۱۹۳۴ء کو واقف کے دولت کدہ پر منعقد ایک مشاعرہ کی صدارت ان کے استاد حضرت تمنا عمادی پھلواری نے کی تھی، جس میں واقف نے جب یہ اشعار پڑھے:

زمانے سے اٹھی ہے رسم وراہ منزل الفت
کہ بڑھتا ہی گیا بعد مسافت قطع منزل سے
چراغ کشتہ بزم محبت ہوں میں اے واقف
فروزاں عمر بھر رہنا ہے مجھ کو سوزش دل سے

تو ہر طرف داد و تحسین کی بارش ہونے لگی اور استاد نے بھی جب اپنے نئے نویلے شاگرد کی اٹھان دیکھی تو دم بخود رہ گئے۔ ۷/مارچ ۱۹۳۶ء کو سید شاہ حسیب الحق ناشاد آروی کے مکان واقع ملکی محلہ کے ایک طرحی مشاعرہ میں واقف کی غزل اساتذۂ سخن سے خراج تحسین لیے بغیر نہ رہ سکی۔ دوسرے دن شرکائے مشاعرہ کی زبان پر ان کا یہ شعر بطور خاص تھا:

یہ امنگیں، یہ ترنگیں، یہ گلوں سے چھیڑ چھاڑ
فصل گل آئی تو عالم ہی نرالا ہوگیا

اس کے بعد تو ان کے کلام کی بازگشت آرا سے نکل کر پورے بہار میں سنی جانے لگی اور وہ بھی پابندیوں کے ساتھ ولی حیدر گہر آروی ابن صفیر بلگرامی کی ''بزم ادب'' کے ماہانہ مشاعروں اور ''حلقہ احباب'' آرا کی طرحی نشستوں میں شامل ہونے لگے۔ اس دور کی غزلوں میں ان کی عمر اور ان کے کلام کا تیور ملاحظہ فرمائیں:

جب نہ رکھا ضبط الفت نے کسی قابل مجھے
دیکھیے طعنوں پہ طعنے دے رہا ہے دل مجھے
کام آئیں ہر جگہ پہ زیست کی ناکامیاں
ہر قدم پر رہنما بنتی گئیں مشکل مجھے

ہر نماز شوق کا انداز بے باکانہ تھا
ہائے کعبہ میں بھی دخل لغزش مستانہ تھا
تو نے پھر تڑپا دیا اے مستی ابرِ بہار
عہد ماضی تو مرا بھولا ہوا افسانہ تھا
اشک حسرت، چشم پرنم، یاس وحرماں، درد وغم
سینکڑوں عنواں تھے لیکن ایک ہی افسانہ تھا

اے دل بے ضمیر سن نالۂ نیم شب مرا
سارے جہانِ خواب کا بارگراں اٹھائے کیوں
محفل دورِ جام سے وعدہ صبح وشام تک
جو انہیں آزما چکا پھر انہیں آزمائے کیوں
واقف زندہ دل یہاں چوک ذرا سی ہوگئی
جس کو ہنسی نہ آسکے اس کو کوئی ہنسائے کیوں

سوز الفت کا زمانہ ہے چھپانا کیسا
شمع جب بزم میں آئی تو فروزاں آئی
یہ آبگینۂ دل وقف ضرب پیہم ہے
نفس کی آمد و شد زندگی کا ماتم ہے
یہ اضطراب لیے صبح انقلاب آئی
چراغ شام غریباں کی روشنی کم ہے

ستم ظریف ہے کتنا جمال فطرت بھی
بہار خندۂ گل ، فیض اشک شبنم ہے
جواب نغمہ چنگ و رباب ہے واقف
شکست دل کی جو آواز آج مدھم ہے

زندگی جب ہوچکی شمع مزار آرزو
کچھ چراغ کشتۂ محفل نہیں ہوتی کبھی

نہ بت خانہ میں نام اس کا نہ کعبہ میں نشاں اس کا
بتاؤ جنس الفت ظالمو ، آخر کہاں رکھ دی

غزلوں کے یہ اشعار تقریباً ۱۹۶۵ء تک کی یادگار ہیں، جو اپنی تمام تر رعنائی و دلکشی اور فنی کمالات کے ساتھ کلاسیکی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، ان میں رنگ تغزل بھی ہے اور جمالیاتی کیف بھی، سوز و گداز بھی ہے اور لذت غم سے آشنائی کا حوصلہ بھی۔ واقف کا حزن و یاس قنوطی نہیں رجائی ہے اور یہی سچا حزن ہے، جو کسی شاعر کو بڑا انہیں عظیم بناتا ہے۔ واقف کی نت نئی تراکیب اور الفاظ کی پیکر تراشی نے انہیں سخنوری کی ایک نئی آواز بنا کر شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا۔ ان کے اشعار کے استعارے، تلمیحات وتشبیہات ایک ایسی امیجری بناتے ہیں، جو بیک نظر ذہن قاری کو اصل موضوع سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان کی یہی خوبیاں ان کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہیں اور انہیں اپنے معاصرین میں منفرد و ممتاز مقام عطا کرتی ہیں۔ انہوں نے فرسودہ مضامین بھی باندھے ہیں؛ لیکن ان میں بھی ان کی انفرادیت موجود ہے۔ وہ غزل کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں کے رمز شناس تھے۔ انہوں نے عارفانہ غزلیں بھی کہیں اور صوفیانہ بھی۔ بعض غزلوں میں رومانی کیف وکم بھی ہے، اگرچہ وہ خالص کلاسیکی مزاج رکھتے تھے؛ مگر غزل میں ہونے والے نت نئے تجربات، اس کے مطالبات وامکانات سے اچھی طرح باخبر تھے، لہٰذا غزل کی ہیئت سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر انہوں نے ندرت وجدت سے کام لیتے ہوئے، ان تمام موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھال دیا، جس کی وہ متحمل ہوسکتی تھی۔ غزل کے چہرے کو نکھارنے اور سنوارنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

دوسرا دور

ستر کی دہائی سے واقف کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔اس دہائی کے آتے آتے ان کی غزلیں عصری حسیت کی خوبصورت ترجمان بن گئیں۔ان غزلوں کا رنگ وآہنگ اور لب ولہجہ اب قدرے مختلف ہو چکا تھا، جو دورسے پہچانا جانے لگا تھا اور وہ تخلیقی اظہار کے شاعر بن کر افق شاعری پر نمودار ہونے لگے، جس نے فرد وسماج کے باہمی ارتباط کی تصویر کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔حیات وکائنات کے بے شمار موضوعات ومسائل ان کی غزلوں کے دامن میں جگہ پانے لگے، جس کا اظہار انہوں نے اپنی بعض غزلوں اور متفرق اشعار میں جا بہ جا کیا ہے:

ہر اک برنگ ٹاپک پر لکھا مرے سوا کس نے
جو لکھا وہ بہ رنگ آتش صحرا لکھا میں نے
زبان سادہ میں رنگینیاں رکھ دیں سیاست کی
مزہ آنے لگا دونوں کو جب یکجا لکھا میں نے
شگفتہ طبع ہوں ہر رنگ ہے باغ وبہار اپنا
ہر اک مضمون خار وگل ترو تازہ لکھا میں نے
مرے اشعار میں ہے بلبل شیراز کا نغمہ
بہت رنگیں لکھا لیکن بہت سادہ لکھا میں نے

چنانچہ حالات نے جب کروٹ بدلی تو واقف کی زندگی میں بھی انقلاب آیا اور ان کی شاعری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔بلبل شیراز کے نغموں کے ساتھ وہ مبصر حیات بھی بن گئے اور اس کے لیے انہوں نے طنز ومزاح اور ہجو وظرافت سے بڑا کام لیا۔یہ ان کے مزاج سے اس قدر ہم آہنگ ہو گیا کہ ۱۹۷۰ء کے بعد ان کی تمام تر شاعری اسی محور کے ارد گرد گھومنے لگی، البتہ انہوں نے کبھی اقدار ومعیار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ایک غزل کے چند اشعار حوالے کے طور پر درج ہیں:

رہے سکونِ دل بے دعا رہے نہ رہے
ہے ذوقِ سجدہ ترا نقش پا رہے نہ رہے

رواں ہے کشتی امید و بیم کیا کہنا
خدا کا فضل تو ہے ناخدا رہے نہ رہے

لیکن اس غزل کے آخری تین اشعار ان کے مخصوص مزاج کا آئینہ ہے، جس رُخ پر بعد میں ان کی پوری شاعری چل پڑی:

مری غزل میں ہے پٹنہ بھی اور دہلی بھی
کسی کا نام کسی کا پتہ رہے نہ رہے
نگاہِ یار میں اسکینڈل کے آنسو ہیں
کسی کی آنکھ میں شرم وحیا رہے نہ رہے
جناب نوح بھی کیا خوب کہہ گئے واقف
کہ تم رہو نہ رہو یہ مزہ رہے نہ رہے

واقف کی غزلوں کے جو نمونے پیش کیے گئے، ان میں فکر کا تنوع، موضوعات کی ہمہ گیری اور مخصوص مزاج کی جلوہ گری دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے مذہبی، ملی، تہذیبی، ثقافتی، سماجی، معاشرتی، لسانی ـــــ غرض حالاتِ حاضرہ کے گوناگوں مسائل پر اپنے سنجیدہ اور مزاحیہ کلام سے اردو غزل کے دامن کو مالا مال کیا۔ انہوں نے قرآنی آیات، تاریخی واقعات، نادر تلمیحات واستعارات، بے مثل تشبیہات اور حسب موقع ضرب المثل کا استعمال تو کیا ہی، انگریزی اور ہندی کے الفاظ سے بھی اپنے کلام کو پرلطف بنایا، جو ان کے سماجی تصورات کو ابھارنے میں بڑے موثر ثابت ہوئے۔ شاید ان کی اسی انفرادیت نے ان سے اس قسم کے اشعار کہلائے:

کیف اندر کیف ہے یا لطف اندر لطف ہے
آپ پڑھیے! لذت اشعار بڑھتی جائے گی

یہ جائزہ، یہ تجزیہ، یہ ہسٹری، یہ مسٹری
مرے قلم کی نوک پر جو آ گیا نہ پوچھیے

افسوس کہ ان کے ابتدائی دور کے غزلیہ کلام کا بیشتر حصہ جو ان کا اصل رنگ سخن ہے، اب ناپید ہے، جو کچھ مشاعروں کے گلدستوں میں، کچھ ادھر اُدھر اخبار و رسائل میں اور کچھ ان کی زبان

سے سننے والوں کے ذہنوں میں محفوظ ہے، وہی دستیاب ہے۔ ایک اور ستم یہ ہوا کہ انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام ''فرمودم'' کے نام سے مرتب کیا تھا اور جس پر بہار اردو اکادمی نے اشاعتی امداد بھی دی، اس کی کتابت بھی ہوئی، اس کے ابتدائی سولہ صفحات چھپ بھی گئے تھے، جسے داخل دفتر کرنے کے بعد رقم کا چیک بھی ملا؛ لیکن اس کی اشاعت مکمل کیوں نہیں ہوئی؟ یہ ایک معمہ بھی ہے اور المیہ بھی، اب تو مسودہ کا بھی کہیں سراغ نہیں ملتا۔ لے دے کر ان کی چند غزلیں میرے پاس تھیں، جو انہوں نے مجھے ''صاحب کتاب'' یا ''شاعر'' بنانے کے لیے دی تھیں، ان کی وہ امانت میرے پاس محفوظ ہے، جنہیں انہیں کے نام منسوب کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تلاش و تصنیف'' میں شامل ایک مضمون کا حصہ بنا چکا ہوں۔ نموناً چند غزلیں ملاحظہ ہوں:

داستانِ غم دل مجھ سے سنائی نہ گئی
آہ! وہ بات جو لب تک کبھی لائی نہ گئی
اب رقیبوں سے بھی ناراض نظر آتے ہیں وہ
بات بے چاروں کی بگڑی تو بنائی نہ گئی
غیر کے در پہ تو سو بار گیا ہوں لیکن
غیر کے در پہ جبیں اپنی جھکائی نہ گئی
دل برا ان کا نہیں لاکھ برے ہوں عشاق
زاہدو! تم سے مگر دل کی برائی نہ گئی
میری ہستی کو مٹایا تو مٹایا لیکن
میری تصویر خودی تم سے مٹائی نہ گئی
نظم فطرت کی قسم شان مشیت کی قسم
طبع عشاق کبھی راہ پہ لائی نہ گئی
کیا در حسن پہ روزانہ صدا دیتے ہیں
ان کے عشاق کی یہ شانِ گدائی نہ گئی
کہتی ہے آ کے نسیم سحری مجھ سے نسیم
جو نہ ہنستے ہوں ہنسی ان کی اڑائی نہ گئی

جو تری نیم نگاہی پہ فدا ہو کے رہا
ساری دنیا سے خفا سب سے جدا ہو کے رہا

اہل دل ہو کے رہا اہل صفا ہو کے رہا
جو تری راہ میں نقش کف پا ہو کے رہا

ہم اگر بیٹھے تو کونین کا دل بیٹھ گیا
جب اٹھے ہم پھر اک حشر بپا ہو کے رہا

سر بریدہ ہوئی دنیائے محبت لیکن
رفتہ رفتہ بت سفاک خدا ہو کے رہا

وہ اسے کرتے گئے خاک چمن میں پنہاں
خون عشاق مگر رنگ حنا ہو کے رہا

شیخ سمجھا نہ مجھے واعظ ناداں سمجھا
دردِ عصیاں ہی مرے دل کی دوا ہو کے رہا

مثل آئینہ اگر منہ پہ کہا صاف کبھی
اپنے احباب کی محفل میں برا ہو کے رہا

اس گلستاں میں رہا اپنی روش پر میں نسیم
بادِ صرصر نہ رہا موج صبا ہو کے رہا

مقام عشق میں ہر رہ گزر سے کام نہیں
ہیں تیرے در پہ کسی سنگ در سے کام نہیں

ملی یہ کہہ کے مناجات پیر میخانہ
دعا سے کام ہے لیکن اثر سے کام نہیں

رفوئے چاک گریباں کریں گے خار چمن
دل حزیں کو کسی بخیہ گر سے کام نہیں

ہوئی ہے شمع بھی گریاں بہ خاک پروانہ
جلا غریب مگر شور و شر سے کام نہیں
جنوں ہے اور بیاباں میں ہے مقام نسیم
کھلی فضا ہے مجھے بام ودر سے کام نہیں

اگر بغور دیکھا جائے تو واقف کے طنزیہ ومزاحیہ کلام ہی نہیں ان کی نعت، سلام، منقبت وغیرہ میں بھی رنگ تغزل کی کمی نہیں ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔

(ب) نظم نگاری

واقف بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے، لیکن نظم گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ عام موضوعات کے علاوہ انہوں نے کثیر تعداد میں نعت، منقبت، سلام، مرثیہ، نوحہ، تہنیتی نظمیں، تاریخ ہائے وفات اور رباعیات وقطعات بھی کہیں۔ روحانیات سے متعلق بھی ان کا اچھا خاصا کلام موجود ہے، جو وجد وعرفان اور علم وآگہی کا عمدہ نمونہ ہے۔ تصوف کے حوالے سے بھی ان کا کلام اثر وتاثیر رکھتا ہے اور خاص معنویت وکیفیت کا حامل ہے۔ انہوں نے تصوف کے حقیقی معنی ومفہوم اور اصطلاحات کی اپنے اشعار میں بڑی عمدہ ترجمانی کی ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر اس ذیل کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

پڑھو صل علیٰ جب گفتگو میں اُن کا نام آئے
نہ جانے یہ عمل کس وقت کس مشکل میں کام آئے
خدا کا حکم ہے جب امت خیر الانام آئے
نبیؐ پر بھیج کر میرے درود آئے، سلام آئے
خدا سے اِندِی قوِی کہہ دیا سرکار نے فوراً
فرشتے ارض طائف میں جو بہر انتقام آئے
ہوں ابراہیم و موسیٰ، نوح و آدم کوئی پیغمبر
شہ لولاکؐ ان کی ہر کٹھن منزل میں کام آئے
نبیؐ کی شان میں ارشاد ہے یہ حق تعالیٰ کا
ہم اس کو بخش دیتے ہیں جو لے کر ان کا نام آئے

مری ہر صبح روشن ہے، مری ہر شام رنگیں ہے
کہ لے کر رحمت عالمؐ، یہ دورِ صبح و شام آئے
بہت فیاض ہیں میخانہ طیبہ کے متوالے
کہیں ساغر بکف پہنچے، کہیں آتش بہ جام آئے
کیا انکار جس نے سجدۂ تعظیم آدم سے
عبادت اس کے کام آئی نہ سجدے اس کے کام آئے
سبق حاصل کرو تم! قصۂ ابلیس و آدم سے
کہیں بیٹھے نہ رہ جانا اگر وقتِ قیام آئے

واقف نے حضرت فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے ان دو نعتیہ اشعار کی جو بدیع المثال تضمین لکھی ہے، وہ بھی داد طلب ہے:

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
"نہیں" سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
فیض ہے یا شہ تسنیم نرالا تیرا
آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا

اب تضمین ملاحظہ ہو:

قہر میں آتا ہے جب رب تعالیٰ تیرا
کانپ کر عرش بھی لیتا ہے سہارا تیرا
سب سے ہے دست عطا دہر میں اونچا تیرا
واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
"نہیں" سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا
عالم غیب وشہادت میں ہے چرچا تیرا
سب کو دیتا ہے ترے ہاتھ سے مولیٰ تیرا
تو وہ داتا ہے کہ ثانی نہیں دیکھا تیرا
فیض ہے یا شہ تسنیم نرالا تیرا

آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا
نام لیتے ہوئے آتے ہیں مسیحا تیرا
زندگی بخش دوعالم ہے وسیلہ تیرا
کیوں نہ بیمار زمانہ میں ہو اچھا تیرا
فیض ہے یا 'شہ تسنیم' نرالا تیرا
آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا

اس کے علاوہ ایک سلام بحضور سید الشہداء علیہ السلام بھی ملاحظہ کریں:

تمام عمر تماشائے چشم تر دیکھا
عجیب لطف شہنشاہِ بحر و بر دیکھا
علیؑ کو قوت بازوئے مصطفیؐ سمجھا
نبیؐ کو اپنے غلاموں سے باخبر دیکھا
ملا حسینؑ سا آقا گناہگاروں کو
دماغ امت مرحوم عرش پر دیکھا
اذاں پکاری جو اکبرؑ نے صبح عاشورہ
حُرِ جری نے بھی اندازۂ سحر دیکھا
حضورِ شہ میں وہ پہنچا مثالِ موج نسیم
نہ سوئے تخت نظر کی نہ مال و زر دیکھا
یہ پوچھتا تھا لعینوں سے جوش نہر فرات
جلال چہرۂ عباسؑ نامور دیکھا؟
بہت طویل ہے یہ داستاں کہ اصغرؑ نے
رُخ حسینؑ بھی القصہ مختصر دیکھا
کوئی مرض ہو شفا حق سے ملتی ہے واقف
یہ نام عابدؑ بیمار میں اثر دیکھا

سوار دوش ناز سید خیرالوریٰ تم ہو
صراط مستقیم نقش پائے مصطفےٰ تم ہو
لکھی قرآن کی تفسیر جس نے خون سے اپنے
سنا میں نے وہ تم ہو، اے شہید کربلا تم ہو
ہو تم سردار جنت یہ رسول اللہؐ کہتے ہیں
خطائے اہل دوزخ تھی نہ سمجھے بے خطا تم ہو
علی مولائے کل، مشکل کشا سب کچھ سہی لیکن
شفیع عاصیان عرصہ روزِ جزا تم ہو
میں واقف ہوں کرم سے نام ہے فضل امام اپنا
برستی ہے جو رم جھم شان رحمت کی گھٹا تم ہو

ایک حدیث شریف ہے: ''اسلام کا آغاز غربت سے ہوا، پھر عنقریب وہ غریب ہو جائے گا''۔
واقف اسے خوش خبری سے تعبیر کرتے ہوئے اپنی منقبت ''دربارِ خواجہ میں'' فرماتے ہیں:

امیر سلطنت مصطفیٰ غریب نواز
نشانِ دائرہ لافتیٰ غریب نواز
بہ شان حیدر کرار جلوہ فرما ہیں
دیارِ ہند میں مشکل کشا غریب نواز
عنایتوں کے جو دریائے بیکراں ہیں علی
نوازشوں کی برستی گھٹا غریب نواز
سنی حدیث فطوبیٰ تو جھوم اٹھی امت
زبان کلمہ پہ جاری ہوا غریب نواز
رسول پاکؐ کے خلق عظیم کے پیکر
لیے مجسمہ مرحبا غریب نواز

لب سکوت محبت تجھے مبارک ہو
سمجھ رہے ہیں ترا مدعا غریب نواز
یہ تیری حاضری آستانہ اے واقف
کرم ہے، ورنہ کہاں تو! کجا غریب نواز

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، واقف کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ شریعت وطریقت کے راہ ورسم کے بھی رمز شناس تھے۔ انہوں نے صوفیائے کرام سے اپنی عقیدت مندی میں متعدد منقبت لکھیں۔ حضرت مخدوم جہاں کی بارگاہ میں اپنی جن کیفیات کا اظہار کیا ہے، اس میں ان کی عقیدت مندی دیکھی جاسکتی ہے:

شریعت کی زباں تم ہو طریقت کا بیاں تم ہو
شرف ہے جس سے دنیا کو وہ مخدوم جہاں تم ہو
گلوں کی چاک دامانی کی رنگیں داستاں تم ہو
عنادل کی فغاں میں روح نغمات اذاں تم ہو
ہو الظاہر ہو الباطن کی نسبت میں فنا ہو کر
کبھی رازعیاں تم ہو کبھی سرنہاں تم ہو
نبیؐ کے لاڈلے، یحیٰؒ منیریؒ کے جگر پارے
علیؓ کا پیار ہے تم پر امیر انس و جاں تم ہو
نہ بھولے تم مجھے عند ملیک مقتدر ہو کر
کرم فوق الیقیں ہے، برتر از وہم وگماں تم ہو
تمہاری بارگاہ فیض میں واقف بھی حاضر ہے
زمانہ جانتا ہے علم وفن کے قدرداں تم ہو

واقف نے اپنے جدامجد سید شاہ شمس الدین سمن اروی کی شان میں جو منقبت لکھی ہے، وہ درج ذیل ہے:

لوح محفوظ ترا ، عرش معلیٰ تیرا
شاہ سمن ! ہے خدا داد یہ رتبہ تیرا

میں نے اجمیر کے آئینہ میں پایا تجھ کو
عکس تیرا تھا جمال رخ زیبا تیرا
ساز دل تجھ کو دیا خواجہ اجمیر نے جب
زمزمہ سنج ہوا کوہ ہمالہ تیرا
عرس سالانہ ترا گیارہویں رمضان کو ہے
سینکڑوں سال سے ارول میں ہے میلا تیرا
ہر مسلمان کو حاصل ہے حمایت تیری
حاصل کلمہ توحید ہے چرچا تیرا
ہے خزانے میں ترے سائل ومحروم کا حق
صاف کہتا ہے یہ اللہ تعالیٰ تیرا
صرف قرآں کی تلاوت ہے ترا فیض وسلوک
اہل الطرق الی اللہ ہے طریقہ تیرا
اس کو قرآں سے شفا مل گئی اللہ اللہ
دل بیمار نے جب پایا سہارا تیرا
اولیا میری نگاہوں سے کہاں چھپتے ہیں
شاہ سمن کوئی ثانی نہیں دیکھا تیرا
بڑھ گئی سید جیلاں کی عنایت مجھ پر
انہیں معلوم ہوا جب ہوں میں پوتا تیرا
طبع واقف کی روانی ہے کرامت تیری
موج در موج ہمیشہ ہے یہ دریا تیرا

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں واقف کے ہاتھوں نظیرا کبرآبادی کی نظموں کی نشاۃ ثانیہ ہوتی ہے۔ موضوعات تو جیسے ان کے سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، جس کی ہر لہران کی گرفت میں ہو، ایسا باخبر اور بانظر شاعر جو ندرت سخن اور جودتِ طبع سے لیس ہو، ماضی بعید میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی نگاہ اسلام کے شاندار ماضی کے اہم واقعات کی طرف تو ہے ہی،

حالاتِ حاضرہ کا کوئی بھی چھوٹا بڑا موضوع ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ ذیل کی نظموں کے عنوانات سے یہ حقیقت مترشح ہو جاتی ہے:

''حالاتِ حاضرہ کے تلخ وشیریں کا مبصرانہ جائزہ''، ''حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں دعوتِ فکر''، ''حالاتِ حاضرہ کے اندھیرے اجالے''، ''حالاتِ حاضرہ کی بیہودہ سامانیاں''، ''حالاتِ حاضرہ کے اندھیرے''، ''دو رخی چال بازی ہے سیاست اے دوست''، ''علامہ اقبال کی تھیئلوجی اور ان کی اسپریچول ازم''، ''قدیم ہندوستان کے عظیم فلسفی بید پائے برہمن کی یاد''، ''فسادات اور دلِ ناتواں کے اندیشے''، ''قرآن اور دل واحسان کی یاد ماہِ رمضان المبارک میں''، ''تو مومن و پنہاں ہے پدیدار ازل سے''، ''ماہِ رمضاں''، ''پیام ماہِ رمضان المبارک''، ''روزنامہ سنگم میں توہین رسالت کی خبر پڑھ کر''، ''فلسفہ امن وامان''، ''روزنامہ سنگم میں پنجاب کے حالات پر کلدیپ نیر کا مضمون نگاہِ واقف میں''، ''۱۵ر اگست کے نام''، ''الیکشن اور حالاتِ حاضرہ کا دلچسپ جائزہ''، ''بابری مسجد ایجی ٹیشن کمیٹی کی شرکت وعدم شرکت کے متعلق ایک عزیز دوست کے نام''، ''نامعلوم مدت تک دہلی میں کرفیو کا نفاذ''، ''مرکزی لا اینڈ آرڈر کے خداوندانِ مجازی''، ''پٹنہ جنکشن پر ریلوے حادثہ''، ''منچلے نوجوانوں سے دعا'' وغیرہ وغیرہ۔

نمونے کے جو عنوانات ہیں ان میں سے بعض میں انہوں نے عالمی سطح پر ایٹمک اسلحوں کی مسابقت، بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں، سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم وغیرہ کی قلعی کھولی ہے، پھر اپنے ملک کے متعدد مسائل، مثلاً غربت، افلاس، جہالت، فرقہ وارانہ فسادات، سیاست دانوں کی سیاسی بازیگری، زوال پذیر معاشرہ، ذات پات کی سیاست، نکسلی تصادم، حکومتوں کی نت نئی پالیسیاں، ملک کی اقتصادی صورتِ حال، لسانی پالیسی جیسے موضوعات پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان میں خصوصیت سے سیاسی قائدین، ملا وواعظ، فرقہ پرست عناصر اور تخریب پسندوں کی مذمت بھی کی ہے۔

واقف محض تخیل کی دنیا کی سیر کرنے والے شاعر نہیں حقیقت پسند اور نباض فطرت تھے۔ زہر ہلاہل کو قند کہنے کے ہنر سے نابلد تھے؛ اس لیے ہر اس مرض پر انہوں نے انگلی رکھی، جو ملک ومعاشرہ اور فرد وسماج کو مریضانہ ذہنیت کی طرف لے جا رہا تھا۔ ''واقف آرٹ'' کے تحت نظموں میں تو وہ ایک ماہر سرجن نظر آتے ہیں، جس میں انہوں نے سماج کے رستے ہوئے زخموں کا آپریشن بھی کیا اور عضو فاسد کو کاٹ کر پھینکنے کا کام بھی انجام دیا، چنانچہ ان کا قلم کہیں جارحانہ، کہیں ناصحانہ اور کہیں ہمدردانہ چلا۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حقیقت اس میں صرف اتنی سی ہے اے دوستو! سن لو
جو بیہودہ تھا اس موذی کو بے ہودہ لکھا میں نے
مگر جو لوگ اچھے ہیں بڑھایا حوصلہ ان کا
بہ بانگ صور اسرافیل انہیں اچھا لکھا میں نے

یہاں ان کی نظموں سے چند نمونے درج کیے جاتے ہیں:

اردوئے معلّٰی کی ادا بھول رہی ہے
وہ حرف و سخن صوت و صدا بھول رہی ہے
جو اس نے پڑھا اس نے سنا، بھول رہی ہے
اسلاف نے کیا اس کو دیا، بھول رہی ہے
کب اس نے کہاں کس سے لیا، بھول رہی ہے
کب اس کو کہاں کس نے دیا بھول رہی ہے
وہ کہتی ہے 'اے پربھو! دیا کیجئے ہم پر'
اردو میں وہ اب 'نام خدا' بھول رہی ہے
اب اس کو مزا ملنے لگا رام بھجن میں
وہ 'صلِّ علیٰ سیدنا' بھول رہی ہے
ہندی میں وہ کر لیتی ہے قرآں کی تلاوت
معلوم نہیں اس کو، وہ کیا بھول رہی ہے
آگاہ نہیں اب وہ نسیم سحری سے
کیا چیز ہے یہ 'بادِ صبا' بھول رہی ہے
کیا ربط اسے 'قافلہ سالار حرم' سے
اقبال کی جب بانگ درا بھول رہی ہے
الفاظ میں ہیں 'زندگی قوم' کے اسرار
افسوس یہی 'درس بقا' بھول رہی ہے

دنیائے معانی میں جو برپا ہے قیامت
اس کو بھی یہ بے چشم وفا بھول رہی ہے
بے غیرتی قوم کی مظہر نہیں بالکل
لیکن یہ حیادار حیا بھول رہی ہے

(نظم: اردو کی نئی نسل)

تعزیت ہو غیر مسلم کی تو یہ جائز نہیں
اور ایصال ثواب و فاتحہ جائز نہیں
منحرف جو اس سے ہو وہ مرتد انجام ہے
منکر آیات قرآں دشمن اسلام ہے
ایسی حرکت کا حقیقی مدعا چیلنج ہے
یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے
اس امارت اور جمعیۃ کے علمائے کرام
اس ادارہ شرعیہ کے مفتیان خوش مقام
ایسی حرکت پر اگر خاموش ہوں زیبا نہیں
اپنے حجروں میں اگر روپوش ہوں زیبا نہیں
ان کو رکھنا چاہیے چہروں کو اپنے بے نقاب
ہو زباں پر ان کے جاری معنی ام الکتاب
نصرتِ دین شہ خیر الوریٰ ہے ان کا نام
حفظ آئین محمدؐ مصطفیٰ ہے ان کا کام
وہ نہ بولیں گر تو مجرم ہیں خدا کے سامنے
اپنے خالق مالکِ ارض و سما کے سامنے

(نظم: یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے)

آیا ہے یہ فساد تو آتا چلا نہ جائے
ہر نقش این و آں کو مٹاتا چلا نہ جائے

جو تشنہ کام جہل ہیں پیتے چلے نہ جائیں
بھر بھر کے جام جنگ پلاتا چلا نہ جائے
اس پردۂ فساد میں جو بدمعاش ہے
تگنی کا ناچ سب کو نچاتا چلا نہ جائے
سمٹے ہوئے غریب بکھرتے چلے نہ جائیں
گیسو وہ اپنے رخ سے ہٹاتا چلا نہ جائے
کمزور ہو چکی ہے جو دیوارِ اتحاد
ٹھوکر سے اپنی اس کو گراتا چلا نہ جائے
ابلیسیت کا خون جو اس کی رگوں میں ہے
روتے ہوؤں کو اور رلاتا چلا نہ جائے
ویرانہ فساد کے ہر گوشے گوشے میں
جوگی کوئی ستار بجاتا چلا نہ جائے
ڈرتا ہے دل زمانہ کے حالات دیکھ کر
ہر روز حشر نو وہ اٹھاتا چلا نہ جائے

(نظم: حادثات اور دل ناتواں کے اندیشے)

ذرہ ہے اپنے زور میں صحرا ادھر ادھر
قطرہ ہے اپنے جوش میں دریا ادھر ادھر
حزب مخالف اب نہیں متحد کہیں
لیکن اچھلتی پھرتی ہے بے جا ادھر ادھر
ہے کانگریس کے ساتھ ہر اک خانقہ نشیں
دل میں لیے ہوئے غم دنیا ادھر ادھر
ہر مولوی بحال ہوا کانگریس میں
لہرا رہا ہے اس کا عمامہ ادھر ادھر

ووٹر غریب کس کو دے گالی کسے نہ دے
ڈوبا ہوا ہے سوچ میں تنہا ادھر ادھر
بے ساختہ زباں سے نکلتی ہیں گالیاں
آتا ہے اس کے لب پہ جو شکوہ ادھر ادھر
زندہ ہوئے ہیں آج مسائل عوام کے
چھیڑا ہے زندگی نے فسانہ ادھر ادھر

(نظم: الکشن اور حالات حاضرہ کا دلچسپ جائزہ)

حادثہ ہی حادثہ ہے ریلوے کا آئے دن
منچلے اب پائدانوں پر لٹکنا چھوڑ دیں
ریل کے ڈبے کی چھت پر چڑھ کے فرماتے ہیں وہ
گارڈ صاحب اپنے گھر جائیں مٹکنا چھوڑ دیں
ان کی گمراہی پیام موت بن کر آگئی
راستہ پر اب بھی آجائیں بھٹکنا چھوڑ دیں
یوں تو ظاہر ہے کہ ہے بہکا ہوا سارا نظام
التجا میری ہے کم از کم بہکنا چھوڑ دیں

(نظم: منچلے نوجوانوں سے التجا)

واقف کی قادر الکلامی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ وہ فی البدیہ اور برجستگی میں تو یکتائے روزگار تھے ہی، مردم شناس بھی تھے اور قدر دان بھی۔ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو بہار راج بھون، کی دعوت پر وہ اس وقت کے گورنر بہار، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوئی سے ملاقات کی غرض سے پہنچے۔ آپس میں خوش گپیاں بھی ہوئیں اور شعر سخن کی باتیں بھی۔ واپسی پر ردّ عمل کے طور پر ایک نظم بعنوان ''حیات مستعار کے چند یادگار لمحے'' کہی جو ۲۱؍ اکتوبر کو منظر عام پر آئی۔ نظم اس طرح ہے:

پڑ گئی ضعف بصارت پہ مرے ان کی نگاہ
دیکھا 'کٹریکٹ' کو حضرت قدوائی نے

میرا دل جیت لیا ان کی پذیرائی نے
کوہِ الوند سے زیادہ نہیں دیکھا اونچا
دلِ صد چاک میں احساس کی گہرائی نے
چائے کے ساتھ چلیں شعر وسخن کی باتیں
وحدتِ فکر جو دی انجمن آرائی نے
آپ کے آرٹ میں ہے وسعت مضموں کتنی
اس طرح دادِ سخن دی مجھے دارائی نے
جو کیا تھا لب اعجاز مسیحائی نے

(ج) طنز وتغزل

واقف کے حالات نے جب کروٹ بدلی تو لوگوں کا مذاق سخن بھی بدلا، جس انداز کی غزلیں وہ ابتدا میں کہتے تھے، وہ ان کا شاہکار تو بنتی گئیں؛ مگر ان کی کفالت کا ذریعہ نہیں بن سکیں، لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے غزل میں ایک نئے لب ولہجہ کو متعارف کرانے میں ہی عافیت سمجھی، جس کی قارئین کی طرف سے بھی بے حد پذیرائی ہونے لگی اور پھر یہی ان کی شاعری کا وصف بھی بنا اور شناخت بھی۔ ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد کی نسل کے لیے تو یہی اندازِ سخن ان کا شانِ امتیاز قرار پایا۔

اس عہد میں بہار ہی نہیں ملک وبیرون ممالک سیاسی ومعاشرتی سطح پر ایک عجیب اتھل پتھل مچی تھی۔ واقف نے موقع کی نزاکت کو سمجھا۔ ایک تو وہ خود بھی حالات کی ستم ظریفی کا شکار تھے۔ بال بچوں کو اللہ بھروسے آرا میں چھوڑ کر پٹنہ میں یوں زندگی گزار رہے تھے کہ ”رہنے کو گھر نہیں ہے، سارا عظیم آباد ہمارا“ آبگینہ دل رِس رہا تھا، جس پر انہوں نے توکل کا مرہم رکھ لیا تھا؛ اس لیے انہوں نے غم جاناں کو نہیں غم کائنات کو گلے لگایا۔ جب یہاں آئے تو روزنامہ ”سنگم“ سے وابستہ ہو گئے، جو اس وقت مشرقی ہندوستان میں حزب مخالف کا سب سے بڑا ترجمان اور مظلوموں کی مضبوط آواز تھا۔ اخبار کے مدیر کی طرف سے فرمائشی موضوعات ملنے لگے اور وہ بھی اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھلاتے رہے، جس کی وجہ سے اخبار کے ساتھ ساتھ واقف کے قارئین کا بھی ایک وسیع حلقہ بن گیا، جو پابندی کے ساتھ ایسی چیزوں کا منتظر رہنے لگا۔ کبھی کبھی جب آبگینوں کو ٹھیس پہنچتی تو واقف کا

''سنگم'' سے طلاق بھی ہو جاتا اور پھر حلالہ کے لیے دوسرے روزناموں میں اپنی طبع رواں کا جوہر دکھا کر پھر ''سنگم'' سے رجوع فرما لیتے تھے۔ انہیں روزانہ کچھ نہ کچھ کہتے رہنا تھا، حالاتِ حاضرہ ان کے لیے پسندیدہ موضوع بنا، جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کا ایک نیا رنگ سامنے آیا، جسے انہوں نے ''طنزو تغزل'' کا نام دیا۔ یہ ایک ایسا سکہ تھا، جو بڑی تیزی سے بازار میں چلا ہی نہیں، دوڑ پڑا اور ان کا روز بروز مطالبہ بھی بڑھنے لگا، جن کی تفصیلات سے پٹنہ کے اخبار بھرے پڑے ہیں۔ ''طنزو تغزل'' نے لوگوں کے زاویہ نظر کو بدلا، ایک حوصلہ دیا اور نئی قوت بخشی۔ اس نے فرد اور سماج کی دادرسی کی، اس کا وزن محسوس کیا جانے لگا۔ بقول واقف:

''پٹنہ آیا تو 'سنگم' میں پناہ لی۔ جاڑے کی ایک صبح تھی۔ نماز فجر کے لیے مسجد پہنچا۔ دیکھتا ہوں امام مسجد ایک سوتی چادر اوڑھے سردی سے کانپ رہے ہیں۔ جتنے مقتدی تھے چسٹر، سوئٹر، شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ بڑا غصہ آیا، کمبخت کے مارے، خدا غارت کرے ان کو۔ واپس آ کر لکھ دیا جس کا ایک شعر یہ ہے:

وہ نشہ ہے تیری نماز میں وہ خمار نار حرام ہے
فقط ایک سجدۂ سہو ہے جو غریب تیرا امام ہے

شام ہوتے ہوتے امام صاحب پر کمبل برس گیا، سوئٹر، شیروانی برس گیا۔ وہ بہت ممنون ہوئے''۔

واقف کی اختراع پسند طبیعت نے رنگ تغزل کو برقرار رکھتے ہوئے ''طنزو تغزل'' میں طنز کی ایسی آمیزش کی، جس کی نظیریں کمیاب ہیں۔ وہ الفاظ سے معنی کا ایک جہاں آباد کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کا خود کہنا ہے:

''حقیقی طنز نگار، نظم ہو، یا نثر، اس میں صرف ایک لفظ سے قیامت برپا کر دیتا ہے''۔

اور ایسا انہوں نے کر کے دکھایا۔ ''طنزو تغزل'' کے تحت غزلیں بیک نظر جہاں فرحت و انبساط سے ذہن کو ہمکنار کرتی ہیں، وہیں دعوتِ غور و فکر بھی دیتی ہیں۔ وہ ایسے اشاروں اور کنایوں کو بروئے کار لاتے ہیں، جن کے معنی کھلتے ہی ذہن کے سینکڑوں دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ چند مثالیں یوں ہیں:

بازو پہ اپنے تمغہ شیطاں لیے ہوئے
سر میں خیال قتل مسلماں لیے ہوئے

پھرتے ہیں سہسرام میں غنڈے اِدھر اُدھر
تیر و سناں و خنجر و پیکاں لیے ہوئے
یہ ساحل سکون حکومت کا فیض ہے
قطرہ ہے سہسرام کا طوفاں لیے ہوئے
ہر صبح سہسرام ہے امید و بیم زیست
ہر شب وہاں ہے خواب پریشاں لیے ہوئے
اے چیف سہسرام کو بھی جاکے دیکھیے
لیکن نگاہِ زود پشیمان لیے ہوئے

ہے اپورچونزم بھی اک مسلک ہستی جناب
مجھ کو کیا سمجھے کوئی اقبال کا راوی چناب
ہے پریکٹیکل خودی میری کتاب لاجواب
اس جہاں میں ہے اصول زیست کی مٹی خراب

سرخی چشم رنگ کبوتر لیے ہوئے
تھا ہاتھ بارہ انچ کا خنجر لیے ہوئے
بھائی کو ڈھونڈتے تھے کہ سالا کہاں گیا
وہ تھا کہ اڑ گیا صف محشر لیے ہوئے
کس طرح رنگ بدلتی ہے دنیا مردود
خود یہ مردود ہے اور اس کا تماشا مردود
میڈم اندرا کا جو فرمان قضا آپہنچا
ہو گئے محسن اردوئے معلیٰ مردود
آئی ایران سے اردو کی غزل میں بلبل
شور اس کا ہے نہ کوئل نہ پپیہا مردود

مجھے کیا کام تو گلفام ہے یا گل بدن ساقی
یہ میرا بھی وطن ہے جیسے اندرا کا وطن ساقی

صبا لگائے گی اندرا کو پھول کی چھڑیاں
نماز خدمت جنتا اگر قضا ہوئی

ہر ایک شے ہے گراں لا الہ الا ہو
ستم کدہ ہے جہاں لا الہ الا ہو
ملا نہ گوشت تو ہیں ساگ پات پر روزے
صدائے بے اثراں لاالہ الا ہو
سحر کے وقت بھی افطار جب نہ ہو واقف
تو کیا کہے گی زباں لا الہ الا ہو

وزیر خارجہ چین آئے بھارت میں
تمام دہلی میں غل مچ گیا ہوانگ ہوا
سنا ہے چین کی بھارت سے دوستی ہوگی
کریں گے ہند کو لطف آشنا ہوانگ ہوا
دیکھو اے گردشِ ایام! مزے کرتے ہیں
ٹیکس ہم دیتے ہیں حکام مزے کرتے ہیں

واعظان قوم بھی باسوز و ساز و باوضو
حضرت اقبال کے اشعار دہراتے رہے
بے خطر کیا کود پڑتے آتش نمرود میں
اس تصور سے بھی وہ حضرات گھبراتے رہے

دوستو! گر جھوٹ کی پھٹکار بڑھتی جائے گی
دیکھتے جانا خدا کی مار بڑھتی جائے گی
ٹھپہ بازی پر ہے جب دارومدار انتخاب
آپ گھٹتے جائیں گے سرکار بڑھتی جائے گی

اچھی نہیں ہمیشہ حقیقت کی بات چیت
کرتے ہیں لوگ اس سے شرارت کی بات چیت
مومن ہلاک لذت افطار ہوگیا
لیکن زباں پہ اس کی ہے جنت کی بات چیت

سنو پہلے کہ ہے معنی پیداوار اتپادن
کرو تم رفع حاجت اور کہو سو بار اتپادن
کئے جا ہاں کئے جا! اے مری سرکار اتپادن
ہے کشت زعفراں تیرا سرِ بازار اتپادن
کہا ذہنی اپج والوں سے بادِ صبح گاہی نے
ملوں میں اور کھیتوں میں کریں فنکار اتپادن
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری بھائی انشا کو
کرے گا کیا کوئی دربار سے بے زار اتپادن
خبر دی حضرت اقبال نے زرخیز مٹی کی
کرے گی کشت ویراں ان کی اب نمدار اتپادن
چلو اے دوست اتپادن کا لے کر آنکڑا رکھ لیں
کہ موضوع سخن ہے برسر دربار اتپادن

بدل چکی ہے زمانہ میں فطرت شاہین
وہ روز و شب کسی الّو کی بارگاہ میں ہے

بھارت کا ہے 'اقبال' کہ 'آزاد' ہیں غنڈے
گالی کے مصنف 'سخن ایجاد' ہیں غنڈے
گلفام ہیں، گل رخ ہیں، پری زاد ہیں غنڈے
نمرود ہیں، فرعون ہیں، شداد ہیں غنڈے
گاندھی کی 'اہنسا' پہ بھی احسان ہے ان کا
آزادی کی تاریخ کو بھی یاد ہیں غنڈے
ہر پولٹیکل پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی
ہر قصر گراں مایہ کی بنیاد ہیں غنڈے
ہر مذہب وملت میں رسوخ ان کا ہے یکساں
ہر قوم کے فرزند خداداد ہیں غنڈے
ہو بھتری چھری ہاتھ میں ان کے تو سر راہ
معلوم یہ ہوتا ہے کہ جلاد ہیں غنڈے
ہو سامنے لیلےٰ تو ہیں یہ قیس برہنہ
شیریں نظر آجائے تو فرہاد ہیں غنڈے
ابلیس کو دعویٰ ہے یہ بیٹے ہیں ہمارے
گو حضرت آدم ہی کی اولاد ہیں غنڈے
ہر فن میں ہیں یہ طاق انہیں کیا نہیں آتا
ہر علم کے پیدائشی استاد ہیں غنڈے
کوئلوں سے بنا دیتے ہیں نقش سر دیوار
بے معنی ہیں اور مانی وبہزاد ہیں غنڈے
اے انجمن خفیۂ تنظیم فسادات
برباد ہوئے شہر تو آباد ہیں غنڈے

جو اسپ وقت تھا سرپٹ چہار گام چلا
بہ ناز و غمزہ چلا، مست وخوش خرام چلا
ادھر سے لیچی کا رس بھیجا ان کو میڈم نے
اُدھر سے جانب بھارت ضیا کا آم چلا
بہت اہم ہے پھلوں کا تبادلہ اے دوست
خبر لذیذ تھی ذکر اس کا صبح و شام چلا
خدا معاف کرے میں فسردہ بیٹھا تھا
اچھل پڑا جو سنا اور شادکام چلا
نوید امن ہے صرف آم اور لیچی نہیں
میں دوستوں کو یہ دیتا ہوا پیام چلا

بقائے باہم نہرو کی یاد تازہ کر
میں یہ نظام چلاؤں تو وہ نظام چلا
بچھا نہ راہ عمل میں کمند مکر و فریب
کبھی نہ ہاتھ سے شمشیر انتقام چلا
زمانہ گرچہ ہے راکٹ کے دوش پر لیکن
بہ یاد ماضی تو رتھ اور تام جھام چلا
اصول کیا ہے؟ فقط زینت کتاب جنوں
تو 'ڈپلومیٹ' ہے دشمن سے اپنا کام چلا

املی کا بیج پیس کے پھانک اے مریض عشق
میری دعا ہے تجھ کو لچکتی کمر ملے

بہار میں ۱۹۵۱ء میں اردو تحریک نے ایک منظم اور مضبوط شکل اختیار کرلی تھی، یہاں شروع

سے ہی اردو کو ثانوی زبان بنانے کا پرزور مطالبہ رہا۔ یہ کئی بار الیکشن ایشو بھی بنا۔ بالآخر حکومت وقت نے ۱۹۸۳ء میں بہار کے پندرہ اضلاع میں کچھ مخصوص معاملات میں اردو کے استعمال کے لیے اسامیوں کی تقرری کی۔ اس میں ہندی ٹائپسٹ کے بھی عہدے وضع کیے گئے۔ ان حالات کے پیش نظر واقف نے اپنے جن ردِ عمل کا اظہار کیا، وہ یوں ہے:

زبان ثانوی بن کر ہوئی ہے جلوہ گر اردو
حکومت کا یہ سکہ ہے اِدھر ہندی اُدھر اردو
زباں مصدر سے بنتی ہے، جو اردو ہے وہ ہندی ہے
بڑھی ہندی مصادر کی بدولت بے خطر اردو
یہ آنا جانا کھانا پینا ہندی بھی ہے اردو بھی
نہ سمجھے تھے تو اب سمجھو پڑھو بے شور و شر اردو
جو ہندی فارسی کے رسم خط میں ہو وہ اردو ہے
اسی ہندی کو کہتے آئے ہیں اہل نظر اردو
ذخیرہ میں ہیں اس کے فارسی عربی کے اسماء بھی
تمہیں کیوں ضد ہے کہہ دے باگھ کو بھی شیر نر اردو

ثانوی درجہ اردو پہ بہت خوش ہے بہار
اس کی قسمت تھی ترا بندۂ احساں ہونا
مرد مومن ہے وہی صاحب ایماں ہے وہی
قومی یکجہتی پہ آئے جسے قرباں ہونا
نکسلائٹ بھی ترے اور پولس بھی تیری
دونوں کانٹوں کو ہے گلزار و گلستاں ہونا
در لیلیٰ پہ ترے مجنوں کا وہ روزہ موت
اسٹمک اتیج میں ذرہ کا درخشاں ہونا
تیری جگنی کا چمک کر وہ عروج پرواز
تیرے جگنو سے وہ جنگل میں چراغاں ہونا

تیرے ساحل پہ ہے بھیگے ہوئے الو کی طرح
جس کو اے پندرہ اگست آتا تھا طوفاں ہونا
لکھ دیا اس نے تجھے ایک محبت نامہ
تھا سٹائر میں جو واقف کو غزل خواں ہونا

علمی وادبی نیز سیاسی وسماجی شخصیات سے بھی واقف کی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ سعدی، شیرازی، عرفی، نظیری سے لے کر میر، غالب، اقبال، اکبر، داغ، جگر وغیرہ کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ نطشے، شیکسپئر، ہلٹن بھی ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ گاندھی، نہرو، آزاد، جوہر سے ان کی عقیدت مندی سب پر عیاں ہے، چنانچہ یہ اشخاص جا بجا ان کے کلام میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے میر، غالب، اقبال، داغ، اکبر، عبدالعلیم آسی، مضطر خیر آبادی اور ریاض خیر آبادی کی غزلوں کی بہترین تضامین بھی پیش کی ہیں اور محمد علی جوہر، محمد مسلم (ایڈیٹر سہ روزنامہ دعوت، دہلی)، پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی، جگر مرادآبادی، مولانا آزاد سبحانی اور الطاف حسین حالی جیسے شعرا پر نظمیں بھی لکھی ہیں۔ علامہ اقبال کو انہوں نے بطور خاص اپنا موضوع بنایا۔ علامہ اقبال پر اگر ان کی تمام رباعیوں، نظموں اور غزلوں سے اشعار منتخب کر کے جمع کر دیے جائیں تو وہ ایک الگ مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ یعنی انہوں نے فلسفۂ اقبال کے ردّ وحمایت میں بے شمار قطعات اور رباعیاں قلم بند کیں۔ واقف نے اپنی ایک گفتگو میں فرمایا تھا کہ انہوں نے اقبال کے خلاف چھ سو رباعیاں لکھی تھیں، جن میں سے بیشتر ''انقلاب''، لاہور میں شائع شدہ ہیں۔ یہاں صرف ایک رباعی بطور نمونہ پیش ہے:

شکوہ پڑھیے ، جواب شکوہ پڑھیے
بیکار نہیں ، سمجھ کر اتنا پڑھیے
پر جاں کی اماں ملے تو یہ عرض کروں
اقبال کو پڑھنا ہے تو یکجا پڑھیے

واقف نے مکالماتی انداز کی نظمیں بھی لکھیں اور سٹائر معلّی، سٹائر اور ہزل کے تحت بھی اچھا خاصا سرمایہ چھوڑا۔ اکثر کلام مختلف رسائل وجرائد کے صفحات میں محفوظ ہے۔

(د) واقف آرٹ

واقف بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ انہوں نے قابل فخر غزلیہ سرمایہ چھوڑا ہے؛ مگر ان کے مزاج کو طنز و مزاح سے بڑی ہم آہنگی تھی، جس میں ظرافت کی چاشنی بھی تھی، سٹائر، ہجو اور ہزل کی آمیزش بھی۔ لہٰذا غزل کی لطافتوں اور نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی طنزیہ غزلوں میں قادرالکلامی کا وہ جوہر دکھایا، جو میر اور غالب سے اقبال اور اکبر تک کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ واقف نے بعد میں ''طنز و تغزل'' کے نام سے ایک نئے انداز سخن کی لذت سے دنیائے ادب کو روشناس کرایا؛ لیکن اس سے بھی ان کی طبیعت کی سیرابی نہ ہوئی تو انہوں نے ''واقف آرٹ''، ''کاشفیات'' اور ''شذرات واقف'' کے عنوانات سے نئی نئی اصطلاحات وضع کرلیں اور ان عنوانات کے تحت اپنے افکار پیش کرتے رہے۔ ''واقف آرٹ'' کے ذریعہ وہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۹۳ء تک اپنی قادرالکلامی کے جوہر دکھاتے رہے، جس نے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر رکھا۔

''واقف آرٹ'' واقف کی عصری شاعری کا دوسرا نام بھی ہے، جو اپنے دامن میں مسائل حیات و کائنات سمیٹے ہوئے ہے۔ اس آرٹ میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ وسعت و ہمہ گیری تو ہے ہی اظہار و ترسیل کی بھی زبردست قوت ہے۔ شاعری کو زندگی کی تنقید بنانے اور شب و روز بدلتے ہوئے حالات پر جرأت و بے باکی سے اظہار خیال کے لیے انہوں نے اس فن سے بڑا کام لیا۔ ممکن ہے اس میں کسی کے لیے تفریح طبع کا سامان ہو؛ لیکن اس آئینے میں انہوں نے دراصل اپنے عہد کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ہماری تہذیب و ثقافت، مذہب و ملت، سیاست و قیادت، سماج و معاشرہ، لوگوں کے عمل و کردار، فکر و عقائد کے ساتھ ساتھ ادب و صحافت اور اخلاقی معیار و اقدار کی کج روی بھی ان کے قلم کا نشانہ بنی ہیں۔ وہ انسانیت اور انسانی قدروں کو صحت مند دیکھنا چاہتے تھے۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہونے والی بدعنوانیوں، عدم مساوات، ظلم و فسادات، جبر و تشدد اور حکومت وقت کی بے حسی سے انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ وہ سماج میں توازن، مسلکی و نسلی منافرت، خود غرضی و مکاری، حرص و طمع کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ اگرچہ ایک زمانہ سے حالات کے نشیب و فراز پر منظوم تبصرے، قطعات و رباعیات متعلقہ عہد کے شعرا قلم بند کرتے رہے ہیں؛ لیکن واقف نے ''واقف آرٹ'' کے تحت پابندی کے ساتھ جیسی پیروڈی اور ہجویں لکھیں، وہ تصور اردو صحافت کی

تاریخ میں ایک نیا موڑ ضرور تھا۔ طویل عرصے تک اتنے تواتر و تسلسل کے ساتھ صبح و شام زندگی کی بدلتی تصویر کی منظرکشی واقف کے سوا کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ انہوں نے ایک فرض کی طرح اسے اپنے اوپر عائد کر رکھا تھا، جو زیادہ تر روزنامہ ''سنگم'' اور کبھی کبھی پٹنہ کے دیگر روزناموں میں شائع ہوتا تھا، چنانچہ ایک روز جب وہ اپنی علالت کی وجہ سے دفتر ''سنگم'' نہیں آسکے اور اخبار ''واقف آرٹ'' سے محروم رہ گیا تو انہوں نے اس کی معذرت ''سنگم'' کے ذریعہ ہی ''واقف آرٹ'' میں یوں پیش کی:

کل بہت بیمار تھا اور آج کچھ اچھا ہوں میں
رات بھر ہوش و حواس گفتگو کچھ بھی نہ تھا
پڑھ رہا تھا میں شفا کے واسطے الحمد بھی
دل میں لیکن نام یاس و آرزو کچھ بھی نہ تھا
اور 'فیرم فاس'، 'بارہ ایکس' میں کھا بھی رہا
صبح کو دیکھا 'بخار شعلہ خو' کچھ بھی نہ تھا
محسن انسانیت ہے 'سوشلز' بھی کس قدر
گرچہ اپنے دور میں یہ چار سو کچھ بھی نہ تھا
'سوشلز' کو تلخ رکھا اس کی تحقیقات نے
پاس اس کے شیشہ و جام و سبو کچھ بھی نہ تھا

عصری تقاضوں کے پیش نظر مدتوں ''واقف آرٹ'' کی شکل میں ان کا قلم خون جگر اگلتا رہا اور وہ اپنی زبردست تخلیقی قوت اور زبان و بیان پر دسترس کے نتیجہ میں نت نئے مسائل سے برسرِپیکار ہوتے رہے۔ اس طرح یہ عوام کے جذبات کی تسکین کا ذریعہ تو بنا ہی حکومت وقت اور صاحب اقتدار کے لیے بھی کبھی خطرے کی آہٹ تو کبھی بانگ درا ثابت ہوتا رہا، جن کی تفصیلات سے پٹنہ کے اردو اخبار بھرے پڑے ہیں۔ یہاں چند نمونے دیکھتے چلیں۔ لکھنؤ شام اودھ، تہذیب و تمدن، علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ رہا ہے، مگر اس کا دامن بھی رہ رہ کر اپنوں کے خون سے لالہ زار ہوتا رہا:

اے صدائے رومن امپائر! ڈیوائڈ اینڈ رول
شیعہ سنی لڑ گئے آپس میں کیا کہنا ترا

نوحۂ شام غریباں ہوگئی شام اودھ
سرخیِ خونِ شہیداں ہے یہ افسانہ ترا
میں نہیں کہتا کہ یہ صورت ہے نازیبا، مگر
لکھنؤ کا آئینہ ہے اب رخِ زیبا ترا
لڑنے والے کیوں نہ لڑتے وہ لڑے خم ٹھونک کر
کارفرما دستِ رنگیں تھا پسِ پردہ ترا
اس طرح آراستہ ہے ملک میں تیری بساط
چال 'فرزیں' کی ہے پیدل ہو یا ہو گھوڑا ترا
ہوگیا سر بر زمیں جب پرچم امن و سکوں
آٹومیٹک طور پر اونچا ہوا جھنڈا ترا

سید جعفر امام بہار کے وزیر اعلیٰ کے بی سہائے (۶۷-۱۹۶۳ء) کی کابینہ میں وزیر آبکاری تھے۔ بہار میں اسمبلی انتخاب کی مہم کے دوران جعفر امام نے ببانگ دہل دعویٰ کیا کہ اگر وزیر اعلیٰ انتخاب ہار گئے تو وہ پٹنہ چھوڑ دیں گے۔ جعفر امام کی کوٹھی پٹنہ میں گنگا کے کنارے تھی اور وہ کتے پالنے کے شوقین بھی تھے۔ سوئے اتفاق کہ وزیر اعلیٰ پٹنہ اور ہزاری باغ دونوں انتخابی حلقوں سے ہار گئے۔ جعفر امام کے دعویٰ کی قلعی واقف نے یوں کھولی:

ہائے وہ صحنِ وزارت کی چمن آرائیاں
اب کوئی کوٹھی لبِ گنگا کہاں پائیں گے آپ
تھا یہ دعویٰ چیف گر ہاریں تو پٹنہ چھوڑ دوں
چھوڑ کر پٹنہ کی گلیاں اب کہاں جائیں گے آپ
اب کہاں السیشین کتوں کی بزمِ رستخیز
اب کہاں بھونکیں گے وہ اب کس پہ غرائیں گے آپ

ایک زمانہ میں فرقہ وارانہ فسادات سے بہار کی سرزمین لال رہی۔ رانچی، جمشید پور، ہزاری باغ، بہارشریف، بھاگلپور اور نہ جانے کہاں کہاں فرقہ پرستی کا ناگ پھن اٹھائے تھا۔ فی الفور انہیں روکنے میں ناکام ہوتی حکومت کی غیرت کو واقف یوں جگاتے ہیں:

مسموم ہے فضائے حکومت بہار کی
رفتار فتنہ خیز ہے ہر نابکار کی
کل پھر فساد ہوگیا جمشید پور میں
ایسی کی تیسی وعدہ و قول و قرار کی

راجدھانی پٹنہ سے گیا کی سمت چند میل کے فاصلہ پر واقع پرسا بازار ہے، جہاں ذات پات، رنگ ونسل کے نام پر بے قصور افراد کے ساتھ بے رحمانہ سلوک روا رکھا گیا، انسان تو انسان مویشی اور مکانات بھی نذر آتش کیے گئے۔ اس سانحہ پر واقف کا ردعمل ملاحظہ کریں، جس میں ان کی جزئیات نگاری داد تحسین کی مستحق ہے:

کیوں ہوئے اس درجہ آتش زیر پا اے لیڈرو
کیوں ہے 'نیچی ذات' میں ماتم بپا اے لیڈرو
ہوگیا 'پرسا' میں بارہ آدمی کا قتل کیوں؟
کیوں انہیں زندہ جلا کر رکھ دیا اے لیڈرو؟
تھے وہ بے چارے گڑیڑی اور تم 'اعلیٰ ذات' ہو
کیوں ہوئی تم سے یہ سرزد 'نیچتا' اے لیڈرو؟
سات عدد تم نے مویشی بھی جلا ڈالے وہاں
گائے، بچھڑے، بیل کی کیا تھی خطا اے لیڈرو؟
کیا یہی دیتی ہے اعلیٰ ذات پیغام حیات؟
کیا یہی ہے زندگی کا مدعا اے لیڈرو؟
کتنے تم بیدرد ہو، سفاک ہو، بے رحم ہو
اور پھر انسانیت نا آشنا اے لیڈرو
آہ جو مارے گئے انسان تھے، انسان تھے
یا کوئی تھا ان کا 'آدم' دوسرا اے لیڈرو؟
ابن آدم کو جلائے ابن آدم کا چراغ؟
یہ انا ہے شیطنت کی انتہا اے لیڈرو

انتقام آباد بھارت میں ہو تم 'دیپک کا راگ'
سازِ ہستی ہو نہ جائے بے نوا اے لیڈرو
ظالموں کو کر نہیں سکتی کبھی قدرت معاف
تم کو بھی پینا ہے اب زہر فنا اے لیڈرو

لندن میں گوروں اور کالوں کے درمیان جب نسلی فساد پھوٹ پڑا تو اس موقع پر بھی واقف خاموش نہیں رہے۔ ان مظلومین کی ہمدردی میں ان کا صدائے احتجاج دیکھئے:

اس مہذب ملک میں بھی گورے کالے کا فساد
ارض پاکستان میں ہے 'چار مقتولوں' کی یاد
زد میں آئے انڈیا ہاؤس کے دو افراد بھی
ہوگئی مجروح خاک نہرو اور آزاد بھی

وزیر ریلوے کیدار ناتھ پانڈے کے زمانے میں کئی ریل حادثے ہوئے، پٹنہ جنکشن پر ہونے والے ایک ریل حادثہ سے متاثر ہو کر واقف کے قلم سے ایسے اشعار کی لڑی جھڑنے لگی:

ایک دو ہو تو کہوں اب کوئی تعداد نہیں
ریلوے حادثہ کی اب کوئی تعداد نہیں
یہ نتیجہ ہے فقط غفلت و نادانی کا
آپ کو اپنے فرائض بخدا یاد نہیں
اپنے ماتحتوں کا گر آپ قلع قمع کریں
میں یہ سمجھوں گا کہ حضرت ستم ایجاد نہیں
آپ احباب سے لے لیجیے کچھ قرض ادھار
آپ کے پاس اگر عقل خداداد نہیں
پٹنہ جنکشن پر یہ حرکتِ ناشائستہ
میں ہوں خاموش مجھے عادتِ فریاد نہیں
آپ کی اہلیت کار کا ہو جاتا حساب
ہائے افسوس کہ نہرو نہیں آزاد نہیں

بابری مسجد کے نام پر ملک میں دہشت گردی کا جو رقص برہنہ ہوتا رہا اور فسطائی طاقتیں جس طرح ایک خاص فرقے کو تختۂ مشق وستم بناتی رہیں، اسی پس منظر میں واقف کے چند اشعار اُس دور کی بربریت کی عکاسی کرتے ہیں:

اولاد بابری کو مٹا دیں گے 'ہیجڑے'
چیلنج یہ بنام مسلماں ہے آج کل
سایہ ہے اس پہ گیسوئے سرمایہ دار کا
بالکل سیاہ شام غریباں ہے آج کل
ہر چیز کی گرانی ہے سر بر فلک نہ پوچھ
لے دے کے اپنا خون ہی ارزاں ہے آج کل
ہر سمت ہُن برستی ہے رتھ کے جلوس پر
یہ لیڈری بھی گنج فراواں آج کل

ڈاکٹروں کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؛ لیکن آج کل کچھ ڈاکٹروں اور ان کے عملوں کا مریض کے ساتھ ناروا سلوک سے آگاہ تو سب ہیں؛ لیکن اظہار کی جرأت واقف ہی میں تھی۔ وہ ڈاکٹر کو فرعون سے تعبیر کرتے ہوئے اس صورتحال کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں:

یہاں ہر ڈاکٹر فرعون بے ساماں نظر آیا
مسلماں بھی یہاں کا سخت بے ایماں نظر آیا
کرمنل نگّی جنس اس کا شعور بدشعاری ہے
انگوٹھے پر ہے شیطاں کے جواس کی ذمہ داری ہے
اسی کے رنگ میں 'اسٹاف' بھی اس کا ہے کیا کہئے
کسے تیر ستم کہئے ، کسے تیغ جفا کہئے
چھری ان کی شناسا گردن بسمل سے ہوتی ہے
ملاقات مریض ناتواں قاتل سے ہوتی ہے
کوئی فریاد کرتا ہے جب ان کی بدسگالی پر
اتر آئی ہے ان کی بدزبانی ماں کی گالی پر

پھر اس کے بعد ان کی فتنہ سامانی ابھرتی ہے
لیے گنگا سے ان کی 'جل پری' پانی ابھرتی ہے
مذمت ان کی واجب اور فرض آدمیت ہے
مریضوں سے جسے الفت ہے اس کو ان سے نفرت ہے

واقف نے اپنے عہد میں رونما ہونے والے تقریباً تمام واقعات وسانحات اور افرادِ زمانہ کو موضوع سخن بنایا ہے، کہیں براہ راست اور کہیں درونِ پردہ۔ ایسی ہی ایک تصویر 'کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی' میں دیکھی جاسکتی ہے:

کہنے لگے جمن سے کل حضرت 'درگاہی'
اللہ کرے کم ہو کچھ تیری کم آگاہی
اس دور کی فطرت ہے عیاری ومکاری
بدگوئی و بدبینی، بدخوئی و بدخواہی
اب طائر لاہوتی عنقائے تصور ہے
جب آگئی شاہیں کے پرواز میں کوتاہی
جب صوفی وملا ہوں دربارِ وزارت میں
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

مذکورہ مثالوں سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی سیاسی، سماجی، ملی وملکی موضوع ''واقف آرٹ'' سے اچھوتا نہ رہ سکا، یہاں تک کہ انہیں کبھی کبھی اس معاملے میں اپنی سطح سے نیچے بھی اترنا پڑا؛ مگر ان اشعار میں بھی الفاظ کی ایسی مار ہے کہ مخاطب تلملا کر رہ جاتا ہے۔ ایسی مثالیں ان کے کلام میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔

واقف کی انہیں خوبیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ۱۸؍ستمبر ۱۹۹۴ء کو حلقہ احباب، آرا کے زیر اہتمام منعقد ''یوم واقف'' کے موقع پر غلام سرور نے اردو دنیا کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا:

''واقف آروی مرزا سودا سے بڑے ہجو گو شاعر تھے۔ میں دنیائے اردو ادب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ مرزا محمد رفیع سودا کے اس ٹکر اور پایہ کے شعر نکالیں۔ طنزیہ کلام ہر شاعر

کے بس کا روگ نہیں۔ روزنامہ 'سنگم' پٹنہ میں 'واقفیات' اور 'واقف آرٹ' کے زیر عنوان جو کلام شائع ہوا ہے اس کا جواب اردو کی پوری ہجویہ شاعری نہیں دے سکتی''۔

('آبشار'، کلکتہ ۶/اکتوبر ۱۹۹۴ء)

یوں تو ملت پر پڑنے والی ہر افتاد سے واقف کا کلیجہ چھلنی ہوتا رہا؛ لیکن ۱۹۸۹ء کے بھاگلپور فرقہ وارانہ فساد سے وہ بہت رنجیدہ تھے اور عملاً بے بس، کر بھی کیا سکتے تھے؛ لیکن اپنی نوکِ قلم سے جو کام کیا، وہ تاریخ کی ایک سچائی ہے۔ ایک دن انہوں نے اس وقت کے گورنر یونس سلیم کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نظم لکھی، نظم کیا تھی مرثیہ کہنا بہتر ہے، جو ''سنگم'' میں شائع ہوئی:

اک جلیل القدر پیغمبر کا تو ہمنام ہے
سورۂ یونس میں پنہاں زیست کا پیغام ہے
کہہ رہا ہے تجھ کو ہر پیر و جواں خوش آمدید
خضرِ ملت ہو تری عمر رواں خوش آمدید
شیشہ دل میں مسلمانوں کی اب تصویر دیکھ
ہر سرِ مسلم ہے زیرِ خنجر و شمشیر دیکھ
دیکھ آبادی میں بے نام ونشاں ہے زندگی
اور ویرانے میں محو صد فغاں ہے زندگی
صفحۂ قرطاسِ بھارت پر نمایاں ہوگئیں
ہستیاں جومٹ کے اجزائے پریشاں ہوگئیں
خونچکاں خنجر بکف قاتل نظر آتے ہیں لوگ
اک بھیانک خوابِ مستقبل نظر آتے ہیں لوگ
اب نہیں باقی رہا مجھ کو کسی پر اعتماد
امن کا نعرہ مچلکہ اور ضمانت زندہ باد
تو اگر چاہے تو اس نکتہ کا ہوجائے نفاذ
بند ہوجائے ابھی فتنہ پسندی کا محاذ

گرچہ ہوگی اس میں تھوڑی سی پریشانی تجھے
تیری یہ کاوش مگر کردے گی لاثانی تجھے
رحم فرما اس پہ اے عزت مآب ، عالی مقام
گفت واقف ختم باید کرد اینجا والسلام

بقول خواجہ افضل امام:

''یونس صاحب آج بحیثیت گورنر تشریف لائے، دوسرے روز یہ تہنیت نامہ اخبار میں شائع ہوا اور وہ تیسرے روز بھاگلپور روانہ ہوگئے۔ وہاں دو دنوں تک ڈاک بنگلہ میں قیام کیا، خود تمام حالات و واقعات سے واقف ہوئے اور جوان کی بساط میں تھا کیا۔ پٹنہ واپس آکر واقف صاحب کو مبلغ ۲ ر ہزار روپے کا چک بھجوادیا''۔

('مضامین افضل'، ص: ۱۹-۱۱۸)

کبھی کبھی سرکاری عہدوں پر فائز افسروں کا بے رحمانہ قتل تلاش و تفتیش اسے مزید معمہ بنا دیتی ہے۔ بہار ریاستی سنی وقف بورڈ کے سکریٹری سراج الحق صاحب کی موت پر واقف کا دوٹوک تبصرہ بڑا معنی خیز بھی ہے اور سبق آموز بھی:

اگرچہ قتل بظاہر ترے عدو نے کیا
مگر شہید تجھے تیری آرزو نے کیا
لگی جو سینہ پہ گولی بہ شرحِ صدر تجھے
قبول ربِّ کریم و رگِ گلو نے کیا
ہمیشہ مجلس اوقاف یاد رکھے گی
ادا جو فرض ترے خوں، ترے لہو نے کیا

ایسے بے شمار موضوعات پر 'واقف آرٹ' بھرے پڑے ہیں۔ اگرچہ ان کی زبان کو بند رکھنے کے لیے بڑی بڑی کوششیں کی گئیں؛ لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکیں۔ بقول غلام سرور: ''واقف نے کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا''۔ واقف نے اپنے اس آرٹ سے واقعتاً بڑا کام لیا اور اس میں شک نہیں کہ ان کی تمام تر شاعرانہ عظمتوں کے باوجود ''واقف آرٹ'' نے ہی انہیں شہرت کے آسمان پر پہنچایا اور جمہوری اور عوامی شاعر بنادیا۔

''واقف آرٹ'' کی زبان کا مطالعہ بھی ایک الگ باب کا متقاضی ہے، جس میں انہوں نے عربی وفارسی کے علاوہ ہندی اور انگریزی زبان کا بھی برمحل استعمال بڑے فنکارانہ طور پر کیا ہے۔ چند مثال دیکھتے چلیں؛

مجھ کو یہ ٹیبل ٹاک کا ساماں نظر آیا
میں بھی چپ تھا ان کے فل اسٹاپ ہوجانے کے بعد

چلو اے دوست اتپادن کا لے کر آنکڑا رکھ لیں
کہ موضوع سخن ہے برسر دربار اتپادن

واقف کے سامنے جو سماج تھا اور جو حکومت تھی، اس کے ردعمل میں انہوں نے کچھ ایسے اشعار بھی کہے:

خدا پناہ میں رکھے حرام زادوں کو
جو بدمعاش ہے شیطان کی پناہ میں ہے

واقف کی اس طرح کی شاعری کو مبتذل اور سوقیت سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ لیکن بقول واقف دنیائے ادب میں حضرت سعدیؒ ہی وہ پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے'' گلستاں'' میں'' ایں چہ حرام زادہ مردانند کہ در بار السقہ سگہارا کشادہ'' لکھ کر لفظ حرام زادہ کو ادبی ڈکشنری کا جزوِلازم بنادیا۔ اگر حضرت سعدیؒ کی سند استاذ ذوق کے پاس نہ ہوتی تو رقیب کو اس آسانی سے حرام زادہ کہنا ان کے امکان سے باہر تھا:

پہنچا ہے اب کمند لگا کے وہاں رقیب
سچ ہے حرامزادے کی رسی دراز ہے

سچ ہے اردو شاعری میں واقف اپنے اس آرٹ کے خود موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ ان کی حیثیت دنیائے سخن میں ایک معمار کی ہے، جس پر اردو شاعری ہمیشہ ناز کرے گی۔ ''واقف آرٹ'' حقائق کی ترجمانی، عصری حسیت کی عکاسی اور جذبہ وخلوص کی آئینہ داری کا دوسرا نام ہے، جو ان کے پختہ سماجی شعور اور فنی مہارت کا علامیہ ہے، جس کی وسعتیں بے پناہ ہیں۔ بقول واقف:

ملی جلی حقیقتوں کا نام 'واقف آرٹ' ہے
الگ الگ نہ پوچھئے جدا جدا نہ پوچھئے

واقف بحیثیت نثر نگار

(الف) تنقید

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے واقف کی نثر سے متعلق کہا تھا:

''اگر علامہ واقف کو نظر انداز کیا گیا تو بیسویں صدی کے صاحب طرز نثر نگاروں کی فہرست مکمل نہیں ہو سکتی''۔

واقف جیسے صاحب طرز اور دیدہ ور نقاد کی تنقیدی خدمات کا نہ اب تک جائزہ لیا گیا، نہ ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی؛ بلکہ اہل نظر نے چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے اپنے منفی رویہ کا ثبوت دیا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ واقف کے مزاج میں تنقید کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہوں نے زندگی اور ادب دونوں کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا اور تا عمر انہیں اپنی شاعری اور نثر میں تواتر سے برتتے بھی رہے۔ ان کی صحافتی شاعری کے علاوہ ''طنز و تغزل''، ''واقف آرٹ'' اور ''خاکے اور دھماکے'' کے تحت لکھے گئے اشعار اور نثری تحریریں دراصل ان کی تنقیدی بصیرت کا ہی پیش خیمہ ہیں۔ وہ بلا تکلف حالات حاضرہ پر منظوم تبصرہ لکھ کر دنیا کی ناہمواریوں کو آئینہ دکھاتے رہے۔ ان کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں ہمارا معاشرہ سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس کی جہات اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ واقف کو مارکسی نقاد میں شمار کیا جائے، ترقی پسند نقاد کہا جائے، یا عملی تنقید نگاروں کی فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا جائے۔

بہر حال، ان کی تنقید نگاری کا اہم محرک آئے دن رونما ہونے والے حادثات و واقعات کے ساتھ قدما و معاصرین کی شعری و ادبی نگارشات تھیں، جن کے سبب ان کا تنقیدی ذہن ہمیشہ متحرک اور فعال رہا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی غیر تنقیدی تخلیقات میں بھی تنقیدی رنگ کہیں نمایاں تو کہیں زیریں سطح پر صاف دکھائی دیتا ہے؛ لیکن یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ اب تک ان کے تنقیدی مضامین، یا ان کے تنقیدی شعور پر مبنی اشعار کا مجموعہ، یا انتخاب سامنے نہیں آیا ہے۔ ''مضامین واقف عظیم آبادی'' اگر چہ اپنے عنوان سے نفس مضمون کا پتہ دیتا ہے؛ لیکن اس کے بیشتر مضامین ان کے تنقیدی رویہ کے ترجمان ہیں، جن میں 'مرزا بیدل اور قاضی عبدالودود'، 'سعدی ازم کی ضرورت'، 'مولانا عثمان فارقلیط کی فوجی

سطح اور امام غزالی، مجھے دیوان غالب پسند آیا، وغیرہ بطورخاص اہم ہیں۔
واقف کی تنقید نگاری پر عبدالوحید کا ایک مضمون تقریباً پچیس سال قبل دو ماہی ''زبان وادب'' پٹنہ میں ''علامہ واقف آروی بحیثیت ناقد'' شائع ہوا تھا، جس میں واقف کے تین تنقیدی مضامین (طبیب آروی کے مجموعہ کلام کا تعارف، تاج پیامی کی شاعری پر تین مضامین اور شاد عظیم آبادی مرحوم کی ندرت سخن) کے حوالوں سے بحث کی گئی تھی۔ مضمون نگار نے اپنے مضمون کے آخر میں ہمیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ:

''جناب واقف آروی مرحوم نے باضابطہ تنقیدی مضامین نہیں لکھے، لیکن ان چند مضامین میں بھی ان کی تنقیدی صلاحیت اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان کی تنقید بڑی منطقی، صاف ستھری اور بے لاگ ہوتی ہے۔ ان کی تنقید میں تقابلی تنقید اور عملی تنقید کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ زبان نہایت شستہ اور رواں ہے، جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں، اس کا ابلاغ آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ان کی تنقید پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی ساری خصوصیات سے بخوبی واقف ہیں''۔

(جنوری تا اپریل ۱۹۹۶ء ص: ۷۷)

واقف کے تنقیدی مضامین کے بکھراؤ کی وجہ سے اردو دنیا ان کے اس 'جزو' کو اُن کی تنقید کا 'کل' سمجھ بیٹھی ہے جب کہ 'اردو زبان کی پیدائش'، 'مطالعہ غالب'، 'گلدستہ بر سرمایہ نشاط' (ثاقب عظیم آبادی کے کلام کا جائزہ) ان کی بہترین تنقید ہیں۔ صوفیانہ ادب کے حوالے سے بھی انہوں نے گراں قدر تنقیدی خدمات انجام دی ہیں، جو مختلف رسائل میں شائع شدہ ہیں۔
واقف کی شعر فہمی غضب کی تھی۔ وہ الفاظ کے زبردست مزاج شناس تھے اور ان کی لطافت و نزاکت پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کے بالکل اولین دور میں آرا کے ایک مشاعرے کی صدارت فراق گورکھپوری فرما رہے تھے۔ ایک شاعر نے جب یہ شعر پڑھا:

ذرا اے ناخدائے عشق میری رہبری کرنا
ہجوم یاس میں واماندگی محسوس ہوتی ہے

تو واقف کی رگ تنقید فوراً پھڑک اٹھی اور فی البدیہہ یہ شعر کہہ کے ''محسوس ہوتی ہے'' اور ''معلوم ہوتی ہے'' کے باریک فرق پر تنقید کر ڈالی۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

یہی اک بات ہے جو اس گھڑی محسوس ہوتی ہے
کہ خامی حاصل صد پختگی محسوس ہوتی ہے

واقف نے جن امور کو اپنی تنقید کی بنیاد بنایا وہ ان کا اعتماد آگیں تنقیدی طریق کار اور استدلالی

نقطہ نظر تھا اور یہی ان کی تنقیدی ترجیحات بھی تھیں۔ میر، سودا، ذوق، غالب، مومن، حالی، اکبر جیسے اساتذۂ سخن کے ظریفانہ وطنزیہ اشعار پر انگلی رکھنا واقف جیسے سخن شناس کا ہی حق تھا۔ بدقسمتی سے واقف کی ایسی تنقیدیں اردو کے عام حلقوں تک نہیں پہنچ سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ واقف ایک صاحب طرز ادیب تھے، ان کی تنقیدی تحریریں تبحر علمی کے ساتھ انشا پردازی کے بہترین نمونے پیش کرتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ شاعری کی نسبت ان کی تنقید نگاری کی طرف لوگوں کی توجہ کم گئی، جب کہ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے ان کی تنقید شاعری پر مقدم ہے۔ اسے بھی ستم ظریفی کہئے کہ تقریباً ساٹھ برسوں تک شاعری کے ساتھ نثر نگاری کے دامن کو مالا مال کرنے والے اس خود فراموش دانشور ادیب کے مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ اکبر امام کاشف نے ان کے انتقال کے تیرہ برسوں بعد ''مضامین واقف عظیم آبادی'' کے نام سے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا، جس کی 'تقریب' میں پروفیسر وہاب اشرفی نے لکھا ہے:

> ''علامہ شاہ فضل امام واقف بنیادی طور پر ایک شاعر تھے، جن کی نگاہیں ہمیشہ وا رہتی تھیں۔ اس طرح کہ وہ حالات وکوائف کی ناہمواریوں کو اپنے ذہن ودماغ میں نقش کرتے رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نثری تحریریں کسی ایک موضوع میں بند نہیں، عظیم آباد اور ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور ادبی صورتوں کی واقفیت کے لیے ان کی نگارشات کی طرف مسلسل رجوع کیا جاسکتا ہے، ان میں ایک طرف تو حساس شاعر کے دھڑکتے اور مضطرب دل کی کیفیات ہیں تو دوسری طرف وہ شیڈس ہیں، جو ایسے اضطراب اور احساس کی عقبی زمین ہیں..... مختلف عنوانات کے یہ مضامین زندگی کی متنوع کیفیات پر محیط ہیں، جن میں خارجی احوال وکوائف تو ہیں ہی، داخلی مضمرات بھی ہیں۔ فہرست پر ایک نظر ڈالیے تو ایسا لگتا ہے کہ مختصر کینوس میں انہوں نے زندگی کی کتنی ہی ناہمواریوں کو سمیٹ لینے کا حوصلہ کیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں ان میں تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور سیاسی پہلوؤں کے مختلف جہات سامنے آگئے ہیں۔ علامہ زبان وبیان پر غایت دسترس اور قدرت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں الفاظ ابلتے ہوئے چشمے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں، ان کی روانی دیدنی ہے۔ علامہ کی نثر میں سوز کے ساتھ تمکنت بھی ہے۔ قول محال استعمال کرنے کے گر سے وہ واقف ہیں۔ آئرنیکل سچویشن پیدا کرنے میں ان کا جواب نہیں۔ لہٰذا ان کی نثر طنز اور مزاح کا آمیزہ پیش کرتی ہے۔ ان کے مزاح میں طنز ایک چھپی ہوئی ٹیس کی طرح ہے، جسے حساس قاری فوراً محسوس کر لیتا ہے''۔

('مضامین واقف عظیم آبادی'، ص: ۱۱-۱۰)

تینتالیس مختصر مضامین کے اس مجموعے کے چند عناوین یہ ہیں: 'ہمارا نصب العین اخلاق

جمہوریت'، 'پٹنہ بھائی سیتا رامیا اور کانگریس'، 'عوام ہوشیار اور خواص تیار'، 'ہندوستانی مسلمانوں کو سلام'، 'سیکولر غالب، سیکولر مومن اور سیکولر شاعری'، 'چیچک اور مسدس حالی'، 'یہ ریڈیو پاکستان ہے، مطلع ملاحظہ فرمائیے'، 'ہاٹ لس ڈیموکریسی، ہڈلس ڈیموکریسی اور لائف لس ڈیموکریسی'، 'چھلنی میں دودھ اور قسمت کو گالی'، 'مسز بھٹو کا زچہ خانہ'، 'سرکاری سادھو، سرکاری ریلیجیس ڈیوائن کے ابا جان'، 'علامہ اقبال اور ایک طوائف'، 'آنجہانی ہٹلر کی ایک تنظیمی حکمت عملی'، 'حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ اور صداقت آشرم'، 'خدا بخش خاں لائبریری، پٹنہ میں چرچل'، 'مسلم کلچر اور اقلیتی کردار: صدائے ماضی سے نوائے حال تک'، 'مسلم کلچر اور اقلیتی کردار خطرات ہی خطرات'، 'مسٹر اولڈھم سیلاب عظیم اور خانساماں جی'، 'دہلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے'، 'مجھے دیوانِ غالب پسند آیا'، 'اللہ رے سادہ لوحی'، 'سعدی ازم کی ضرورت' وغیرہ۔

شگفتہ نثر اور باغ و بہار انداز میں لکھے گئے یہ تنقیدی مضامین پہلی نظر میں ہلکی پھلکی طنزیہ ومزاحیہ تحریر کا احساس دلاتے ہیں، جن کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں؛ کیوں کہ متعلقہ موضوع کے تناظر میں عہد ماضی اور حال کے متعدد واقعات کے درمیان مختصر سیاسی و ادبی حوالے، برمحل اشعار اور ضرب المثل اور نفس مضامین کے دیگر امتیازات ہوا کے ایک فرحت بخش جھونکے کی طرح قاری کو فرحت وانبساط کی کیفیتوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔ بعض مضامین فن انشائیہ نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں، مگر ان کا اختصاص یہ ہے کہ ان میں ''باتیں بنائی نہیں گئی ہیں'' باتیں بتائی گئی ہیں۔ کچھ کی نوعیتیں تمدنی، سیاسی و تاریخی ہیں اور بعض ظریفانہ وہجویہ ہیں، جسے خود واقف نے ''واقف آرٹ'' کا نام دیا ہے؛ لیکن بحیثیت مجموعی ان مضامین کی روح میں اترتے اترتے یہ احساس ابھرتا ہے:

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

''مضامین واقف'' ملکی وبین الاقوامی حالات کا اشاریہ ہیں۔ ان میں بعض بین الاقوامی حالات کی ستم ظریفیوں کے عکاس ہیں، جیسے: مسز بھٹو کا زچہ خانہ، آنجہانی ہٹلر کی تنظیمی حکمت عملی، مسٹر اولڈہم، سیلاب عظیم، خانساماں جی وغیرہ عالمی، سیاسی بازیگری کا تبرا ہیں تو سرکاری سادھو، سرکاری ریلیجیس، ڈیوائن کے ابا جان، جمہوریت کی چڑیا کس شاخ پہ بیٹھی ہے، پٹنا بھائی سیتا رامیا اور کانگریس، اس وقت کی ملکی صورتحال کا مرثیہ ہے، جب کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں چرچل، امید کی کرن عبدالغفور، کرکٹ کا پہاڑ وغیرہ مقامی وعلاقائی موضوعات سے متعلق ہیں، البتہ سیکولر غالب، سیکولر مومن اور سیکولر شاعری، سعدی ازم کی ضرورت، مجھے دیوان غالب کیوں پسند ہے جیسے مضامین ذہن قاری کو دعوتِ غور وفکر دیتے ہیں۔ چیچک اور مسدس حالی، یہ زہریلے دودھ کے زہریلے مکھن، علامہ اقبال اور ایک طوائف، دہلی کی بیٹی اور متھرا کی گائے جیسے موضوعات تفریح تفنن کے ساتھ ہماری فکر کو بھی بیدار کرتے ہیں۔ چند اقتباسات درج ہیں:

"میر تقی میر شاعر آدمی تھے، انہوں نے گلاب کی پنکھڑی دیکھی اور لبوں کی نازکی کو تشبیہ سے رنگین کردیا۔ حقائق و مظاہر کا شعور احساس اور ادراک جس کو براہ راست ہوجائے، وہ طبیعتاً شاعر ہوجاتا ہے، خواہ اس کے لب زندگی بھر ردیف و قافیہ سے ناآشنا ہیں، علم ہر جگہ بڑھ رہا ہے، شعور ہر جگہ گھٹتا جارہا ہے۔ دنیا کی اصلی عصبیت یہی ہے، جب بادِ نسیم کی اٹھکھیلیوں سے بیزار ہوکر لوگ بیٹھ جائیں تو جستجوئے حقیقت اور تعمیر انسانیت کا جذبہ ہندو مسلم فساد، عالمگیر جنگ، اور ورلڈ وار کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔ مولانا شہاب الدین ندوی کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے علم کا گھوڑا زیادہ تیز دوڑتا ہے، یا ان کے شعور کا ٹٹو؟

راقم الحروف کو ان کی ذات گرامی سے اس لیے دلچسپی پیدا ہوئی کہ موصوف کو قرآن کی تحریف معنوی میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت کریمہ کا ترجمہ اس آن بان سے کون کرسکتا ہے کہ 'معروف' کا ترجمہ جانی پہچانی حقیقت اور 'منکر' کا ترجمہ امر ناشناس ہوجائے۔ جانی پہچانی حقیقت تو پھول بھی ہے اور کانٹا بھی، زہر بھی اور تریاق بھی۔ مولانا ندوی کے علم کا گھوڑا بھی ہے اور شعور کا ٹٹو بھی، بلبل بھی ہے اور الو بھی، اندرا بھی ہے اور بھٹو بھی۔

پھر یہ امر ناشناس کیا بلا ہے، جو منکر کے ترجمہ کے طور پر مولانا ندوی نے ہماری تعلیم کے مسئلہ میں درج فرما کر یہود و نصاریٰ کی عمومی روحِ تحریف کو جہنم میں بھی پانی پانی کردیا"۔

('مضامین واقف' ص:۷۹-۸۰)

"آزادیٔ ہند کی تاریخ اب ایک صدی کی چوتھائی پر قابض ہوچکی ہے۔ دہلی کی مرکزیت ہو، یا بہار کی صوبائیت اور ریاستیت انگریزوں کے منفی قوانین کے فرسودہ اوراق کو شہد لگا کر چاٹ رہی ہے۔ انگریز شہنشاہیت نے تعزیرات ہند مرتب کی اور حق یہ ہے کہ دنیائے قانون سازی میں تعزیرات ہند کا علمی اور فنی مرتبہ جرم و سزا کی قدیم سیاسی تعریف کے مطابق جامعیت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے بہت بلند ہے؛ مگر علم قانون اور علم سیاست کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ شہنشاہیت کا تصور حکومت چند انتظامی امور اور عوام کی باہمی حق تلفیوں کے متعلق ایک تعزیری طاقت کی حد تک محدود تھا۔

اس وقت حکومت ایک منفی طاقت تھی اور اس کے پاس منفی قوانین کے سوا دوسرا سرمایہ موجود نہ تھا۔ بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ تنازع للبقا کا شیطانی نظریہ حیات بھی اپنی ساری تباہ کاریوں کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے؛ مگر اس نظریہ تنازع للبقا کو اسکولوں، کالجوں اور علمی کتابوں کے

ذریعہ گھر گھر پھیلا دینا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اکبرالہ آبادی کا احساس چیخ اٹھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

غلط تعلیم نے دلوں کی بستی اجاڑ کر رکھ دی۔ انسان کے بچے درندے، بہائم، بھیڑیئے اور چھوٹی مچھلیوں کو نگل جانے والی بڑی مچھلی بن کر نادر، چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ کرنے لگے، اپنے مفسدانہ طرز عمل کے لیے ان کے پاس تنازع للبقا کا فارمولا موجود تھا، جس پر فلسفیانہ طرز کی انگریزی مہریں ثبت تھیں۔ اب کمزوروں کے لیے چرخ نیلی فام کے نیچے پناہ کی کوئی جگہ نہ تھی؛ کیوں کہ وہ چھوٹی مچھلی تھی اور چھوٹی مچھلی ہونا بجائے خود وہ جرم ہے، جس کی سزا بڑی مچھلی اس کو نگل کر یقیناً دے گی''۔

('مضامین واقف' ص: ۲۳-۲۴)

''آج سے ڈیڑھ دو سو سال قبل چیچک یورپ کی مہلک بیماری تھی۔ چین میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک حکیم نے اس مرض سے بچنے کا یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جو لوگ چیچک سے صحت یاب ہو جاتے تھے، ان کے کپڑے اتار کر ان کے بچوں کے گلے میں ڈال دیئے جاتے تھے، چیچک کا مرض ان پر کبھی حملہ نہیں کرے گا، چین کا یہ نظریۂ علاج پھیلا تو یورپ نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ چیچک کے مریض کے دانوں اور چھالوں کا پانی سوئی کے ذریعہ تندرست آدمی کے جسم میں داخل کیا۔

ڈاکٹر 'جیز' نے ۱۷۹۸ء میں ٹیکہ ایجاد کیا۔ اس نے اپنے حفاظتی طریقہ علاج پر پمفلٹ شائع کر کے یورپ کے ہر ملک میں پھیلا دیا، سارا یورپ اس کا معتقد ہو گیا۔ انگلستان کے بادشاہ نے اس پر انعامات کی بارش کر دی۔ سن لیا آپ نے؟ اس طرح مشرقی جہالت اور مشرقی جہالت کی قیاس آرائیوں پر یورپ کا تجربہ اندھے کی لاٹھی سے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ اس وقت سرسید مرحوم کی وہ گالیاں خدا کو معلوم کیوں یاد آ رہی ہیں جو 'مسدس حالی' کی زبان میں خواجہ حالی مرحوم کے قلم فصاحت رقم سے ان لوگوں کو دی گئی تھیں جو طب یونانی کے معتقد اور شیخ الرئیس حکیم بوعلی سینا کی تصنیفات کے خوشہ چیں تھے''۔

('مضامین واقف' ص: ۴۰-۴۱)

واقف اپنے عہد میں رونما ہونے والی ہر ادبی و سیاسی تحریک اور فکر و عقائد کے علاوہ ملی، مذہبی، و سیاسی حالات و کوائف، نیز قومی اخلاقی صورتحال سے باخبر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہر مرض کا علاج دوا نہیں، جراحی بھی ہے، چنانچہ ان کے جذبات میں جب تلاطم پیدا ہوتا، دماغ میں طوفان اٹھتا، دل کی

دنیا میں ہلچل مچتی تو وہ کبھی ''اخلاقی جمہوریت نجات کا واحد راستہ'' کی تلاش میں نکلتے تو کبھی ''گرانی اور مہنگائی بھتہ'' کی مضحکہ خیزی پر ہنستے تو کبھی ''مسلم کلچر اور اقلیتی کردار: صدائے ماضی سے نوائے حال تک'' کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے اور جب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے تو ''مسلم کلچر اور اقلیتی کردار خطرات ہی خطرات'' سے بھی متنبہ کرتے۔ اس پر مستزاد، ان کی پر شکوہ نثر جو انتہائی دلکش، موثر، چھوٹے چھوٹے سبک جملے، بامحاورہ زبان، فصاحت و بلاغت کا مرقع، دل کو چھو لینے والی عبارت آرائی اور اشارات و کنایات ان کے تخلیقی نثروں کے حسن میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ ہر دو چار جملوں کے بعد برمحل اشعار اور ذہن کے دریچوں کو کھولنے والے واقعات قاری کے دل پر اپنا خاص اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اس پر ان کا مخصوص طنزیہ و مزاحیہ پیرایہ، ظرافت و لطافت کے ساتھ پڑھنے والے کے دماغ میں ایک تازہ ہوا کی طرح داخل ہوتا ہے۔

واقف کے مضامین کا ایک انتخاب تو محفوظ ہو گیا؛ لیکن ان کی تحریروں کا ایک بہت بڑا حصہ غیر منقسم ہندوستان کے رسائل و جرائد میں بھرا پڑا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں وہ جب آرا سے پٹنہ منتقل ہوئے، اس کے بعد سے ان کے مقالات و مضامین کے موضوعات کا دائرہ انتہائی وسیع ہوتا گیا۔ وہ بیک وقت تنقید نگار، سیرت نگار، وقائع نگار، سوانح نگار، مزاح نگار، انشائیہ نگار اور تجزیہ و تبصرہ نگار تھے۔ ان کی نثر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ موضوعات کے لحاظ سے مختلف النوع ہونے کے ساتھ مختلف اصناف ادب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں؛ اس لیے ان کا اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے، جو ان کی تحریر کی پختگی کا نتیجہ تھی۔ ان کی ادبی تنقیدیں جہاں سلاست روی، سادگی اور سائنٹیفک نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں، وہیں مذہبی مضامین میں قلم عموماً عقیدت مندانہ اور سنجیدہ ہوتا ہے۔ ان میں جملے انتہائی بجے تلے اور حشو و زوائد سے پاک ہوتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں شعری حوالوں کے بجائے قرآنی آیات اور اسلامی واقعات سے اپنے موضوع کو مدلل و مستند بنانے کا وہ ہنر جانتے ہیں۔ سیرت نگاری میں شخصیتیں ہمارے سامنے چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، جب کہ وقائع نگاری میں واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں اور پڑھنے والا خود کو اس کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ تاریخی، سیاسی و تاثراتی تحریروں میں وہ اپنی جولانی طبع کو قابو میں رکھتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں ان کی غیرت و حمیت پوری طرح بیدار رہتی ہے۔ البتہ جو چیز ان کی نثروں میں مشترک ہے وہ ان کا علمی وقار، معلومات اور مستحضر حافظہ ہے۔ ان کے بعض مضامین کو پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ سے متعلق ان کی معلومات جتنی وسیع تھی ہندو میتھالوجی پر بھی انہیں دسترس تھی۔ وہ تاریخ سے بھی کما حقہ آگاہ تھے اور سیاست سے بھی۔ دنیا میں روز بروز وقوع پذیر ہونے والے واقعات کا بھی انہیں گہرا علم تھا، مختلف ایجادات بھی ان کی نگاہ میں تھیں۔ عام طور پر جنہیں واقف کا ہلکا پھلکا مضمون تصور کیا جاتا ہے ان

میں 'اخلاقی جمہوریت' ان کے افکار و خیالات کا نقطۂ عروج ہے، جو نذرِ قارئین ہے:

اخلاقی جمہوریت

''اخلاقی جمہوریت کی روح عضوی جمہوریت ہے:

باطل کم سواد سبق قصہ ہائے دوست
صد بار گفتہ و دگر از سر گرفتہ ایم

جذبۂ بے اختیاری کا سیاسی و اصطلاحی نام ہے، جس کے تحت انسان یہ اعلان کرتا ہے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

سارے جہاں کا درد تو بڑوں کی باتیں ہیں: مگر چھوٹے سے چھوٹا پیمانۂ فکر بھی ساری قوم کا درد سارے ملک کا درد اپنا سرمایۂ حیات نہ سمجھے تو اس کا وجود انسانیت کے لیے پیغام ماتم ہے۔ یہ چیز مفروضہ نہیں؛ بلکہ مسلمات کا درجہ رکھتی ہے کہ فلسفہ اخلاق کے خادموں، نوکروں اور غلاموں کی ہے۔

اخلاقی جمہوریت اس اصول کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر جو قوانین بنائے گئے، جو احکام جاری کیے گئے تاریخ کے وسیع اور عمیق تجربات نے ان کی ناکامیوں کی حسرتناک داستانیں دنیا کو سنائی ہیں۔ دنیا کو سورج، روشنی، ہوا، پانی، غذا اور دوسرے اسباب زندگی کی طرح فلسفہ اخلاق کی ضرورت ہے۔

تہذیب شائستگی، آدمیت کے بغیر کوئی حکومت، کوئی قوم، کوئی ملک زیادہ دیر تک زندگی کے اسٹیج پر اپنا کھیل نہیں دکھا سکتا۔ بائبل کے اوراق نے دنیا کو یہ بتایا تھا کہ خداوند خدا زمین پر اپنے نیک مزاج بندوں کو حکومت اور طاقت عطا کرے گا۔ انہیں سرسبز و شاداب بنائے گا؛ لیکن شریروں کے خیمے اکھاڑ دیئے جائیں گے۔ تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی صالحین کی وراثتِ ارضی کا اعلان کیا ہے۔ گیتا میں بھی جس دھرم کی توہین پر کرشن جی نے مردے از غیب بروں آید و کارے بکند کی چیتاؤنی دی ہے۔ اس سے مراد یہی فلسفہ اخلاق اور اس سے غیر متبدل بنیادی اصول ہیں۔

انگریزوں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ جمہوریت کے سب سے بڑے مدعی اور نقیب انگریز ہیں؛ لیکن ان کے پاس دستور موجود نہیں، صرف رسم و رواج کی بنیاد پر محدود شہنشاہیت کے زیر سایہ کاروبار چل رہا ہے۔ ہندوستان میں جس وقت دستور سازی کی منزل سامنے آئی، انگریز کوئی نشانِ قوم نہ دے سکے۔ امریکہ اپنے دستوری امور میں ساری دنیا سے مختلف ہے۔ روس کو جمہوریت سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ اس کے نظریۂ اشتراکیت مذہب ہی نہیں؛ بلکہ انسانیت کے بنیادی اخلاق کا بدترین معاند، بدترین دشمن اور مخالف ہے۔ روس سے ہندوستان کے دستور ساز دماغ کو کیا روشنی ملتی؟ نتیجہ بے آب و رنگ جمہوریت اور اخلاق سے عاری، یا بے بنیاد جمہوریت کی شکل میں کاغذی پیرہن پہن کر نمودار ہوگیا۔ دستور ساز اسمبلی کی شوخیِ تحریر نے ہر نقش کو نقشِ دنیاوی بنا کر رکھ دیا۔ آج ہر پیکر پیکرِ تصویر ہے۔ جس کو سر بازار جلا کر خاکستر کیا جا رہا ہے۔ پھولوں کی ہنسی بھی آنسو گیس کے بے تحاشا استعمال سے گریۂ شبنم بن چکی ہے۔

حکومت اور عوام دونوں اپنے اپنے طرزِ عمل کی حمایت میں دلائل کا دفتر لیے پھر رہے ہیں اور فلسفۂ اخلاق اپنے دونوں باغیوں کو یکساں طور پر سزا دے رہا ہے:

دہر میں رازِ بقا آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ ساحل بن گئیں

اگر آگے بڑھنا ہے تو پیچھے ہٹنا اب تلخ تجربات کی روشنی میں مجبوری بن چکا ہے۔ گویا ملک کو خانہ جنگی کی آگ سے بچانا ہے تو اپنی جمہوریت کو اخلاقی سطح مہیا کرنی ہوگی۔ جس جمہوریت کی بنیاد اخلاق پر نہیں، بے بنیاد جمہوریت ہے، ہوا میں معلق رہے گی اور اپنے ماننے والوں کو بھی ہوا میں معلق رکھے گی۔ ہوا کا ہر جھونکا اسے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف منتقل کرتا رہے گا۔ دستور میں ترمیم کی نزاکتوں کا اندازہ کیے بغیر کوئی قدم اٹھا دینا حد درجہ خطرناک ہے۔ میر تقی میر مرحوم کے اس شعر کو رہنما اصول کے طور پر سامنے رکھیے:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

جس وقت آپ اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنی جمہوریت کی بنیاد و اساس قرار دیں گے

اسی وقت سزا یافتہ غنڈے شہر اور دیہات کے جانے پہچانے لچے، لفنگے لازماً حق رائے دہی سے محروم ہو جائیں گے؛ مگر ان کے دوسرے حقوق شہریت بدستور محفوظ ہوں گے؛ مگر ووٹ دینے، ممبر اسمبلی بننے اور وزارت کی کرسیوں پر ساری شرارتوں، بدمعاشیوں اور غنڈہ گردیوں کے ساتھ قبضہ کرنے کا پیدائشی حق ہوا میں گرد و غبار بن کر اڑ جائے گا۔ صحیح صالح اور صحت مند اخلاقی معاشرہ حکومت بنائے گا۔ اراکین حکومت کو منتخب کرے گا، شرارت پسند غنڈے ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی صرف تماشائی ہوں گے، یا زیادہ سے زیادہ چشم عبرت کے لیے ایک تماشہ ہوں گے۔ اخلاقی جمہوریت ان کی غذا، تعلیم، لباس، مکان، ملازمت اور کاروبار کا انتظام بہر حال کرے گی، لیکن انہیں رائے دہی یا حکومت سازی سے اصولاً بے دخل کر دے گی''۔

('مضامین واقف' ص:۱۰۱-۱۰۳)

واقف کے اس نوع کے مضامین نقش اوّل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نثر کی دوسری دنیا ان کے وہ تنقیدی مضامین ہیں، جو الگ سے بحث کے متقاضی ہیں، البتہ ان کا گل سر سبد ان کی غیر مطبوعہ تحریر ''نگارشاتِ واقف'' ہے، جو انتہائی ضخیم بارہ جلدوں میں خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی ملکیت ہے اور ہنوز مسودہ کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسے کسی نے بہار کی ادبی و سیاسی تاریخ کا نام دیا ہے، کسی نے آرا کی ادبی تاریخ بتایا ہے، جب کہ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی فرمائش پر بہار کی ادبی، سیاسی اور سماجی تاریخ بھی لکھی ہے، جو تشنہ اشاعت ہے''۔ گو اتنے سارے تعبیرات سے ''نگارشات واقف'' خواب پریشاں ہو کر رہ گیا، یا بالفاظ دیگر ''دی سکس بلائنڈ مین اینڈ دی ایلیفینٹ'' جیسی مضحکہ خیز صورت حال ہو کر رہ گئی۔

دراصل ''نگارشاتِ واقف'' کے نام سے جو مسودہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے، اس بھاری پتھر کو لوگوں نے دور سے ہی چوم کر چھوڑ دیا، ایک دو ایسے خوش نصیب بھی ہیں، جن کو اس کی زیارت کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ''مضامین واقف'' کے مذکورہ اقتباسات سے کسی حد تک واقف کی نثر کے مجموعی رنگ اور اسلوب نگارش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ بغیر کسی اہتمام کے ساری عمر لکھتے رہے، البتہ ان کا غیر مطبوعہ مسودہ ''نگارشات واقف'' کا انداز ان کی دیگر تحریروں سے یکسر مختلف ہے اور یہ موضوع کے اعتبار سے بھی ان کا ایسا شاہکار ہے، جسے دیکھ کر حیرت ہوتی

ہے کہ علم وادب اور شعر و سخن کے علاوہ ادب کے دیگر شعبوں میں ان کی ہمہ جہتی کتنی وسیع، وقیع اور پر معنی تھی، جو کام کسی ادارے اور اکادمی کا تھا، چند برسوں میں واقف نے اسے کر دکھایا، اس میں ادبیات ولسانیات، اسلامیات وسیاسیات کے علاوہ بے شمار موضوعات پر انہوں نے معلومات کے دریا بہائے ہیں۔ ذیل کی متفرق مثالوں سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے متعلق ان کا نظریہ کیا تھا اور ادب ولسانیات کے باب میں ان کی کیا رائے تھی۔

اسلام سے متعلق واقف کے نقطۂ نظر ان کی زندگی، ان کی شاعری اور ان کی نثری تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میری سب سے پہلی وفاداری اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ انہوں نے ''نگارشاتِ واقف'' میں اسلام سے متعلق اپنے جن نظریات وعقائد کی ترجمانی کی ہے، وہ روح اسلام کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ ان کے خیالات دیکھئے:

''اسلام صرف ایک دین اور مذہب نہیں ہے، وہ ایک دستور حیات اور ضابطہ زندگی بھی ہے اور وہ صرف یہ نہیں بتاتا کہ ایسا کرو تمہاری روح پاک ہو جائے گی، وہ یہ بھی حکم دیتا ہے کہ ایسا کرو تمہاری دنیا سنور جائے گی۔ وہ صرف آخرت کی توجیہ نہیں کرتا، وہ دنیا کو بھی پوری اہمیت دیتا ہے۔ وہ صرف مسجد کے اندر موجود نہیں ہے، اس کا نشیمن انسان کا دل ہے، وہ ہر کام پر فیصلہ اور خیال پر عمل کا جائزہ لیتا ہے اور احتساب کرتا ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، ملنے جلنے، پڑھنے لکھنے، آنے جانے ہر چیز پر اس کی قدغن ہے، ہر چیز کو دیکھتا اور پرکھتا اور جانچتا ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ دنیا چھوڑ دو، آخرت کو پالو گے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ دنیا کو اچھی طرح برتو، آخرت بن جائے گی۔ وہ دین کے لیے دین کو اور دنیا کے لیے دنیا کو لازمی اور اساسی قرار دیتا ہے۔ وہ ایک کو دوسرے کی ضد اور مخالف قرار نہیں دیتا۔ وہ ایک کا دوسرے سے اشتراک وتعاون لازمی قرار دیتا ہے۔ جس شخص کی دنیا اچھی نہیں، دین بھی اس کا کامل نہیں۔ جو دنیا نہیں برت سکتا، وہ آخرت بھی محمود نہیں بنا سکتا۔ اس نے ہر چیز کا ایک ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ وہ جنگ کے میدان میں، خلوت خانہ میں، مسجد میں، محراب میں، کاروبار کی دکان اور دفتر ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی فرمانروائی اور سلطانی ہر جگہ موجود ہے۔ اس نے ہر ایک کو ایک مقصد کا تابع کر دیا ہے۔ مقصد اگر نہیں حاصل ہوتا تو پھر عمل بیکار ہے۔ یہ امتیاز ادیان ومذاہب میں صرف اسلام کو

ہی حاصل ہے کہ اس صاف اور واضح الفاظ میں عبادت واعمال کی تعین وتحدید کردی ہے؛ تا کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے؟ ہمارے قول وعمل سے حاصل ہوا بھی کہ نہیں''۔

مرد مومن کے فضائل وخصائل سے قرآن واحادیث بھرے پڑے ہیں۔ مفسرین ومحدثین نے بھی اس کی کافی توضیح وتشریح کی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار اس سلسلے میں ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کا فلسفہ مرد مومن قرآن واحادیث کے تناظر میں مومن کے معیار واقدار کو متعین کرتا ہے۔ علامہ واقف نے بھی ''نگارشاتِ واقف'' میں مومن کے اوصاف حمیدہ پر انتہائی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ایک عام فرد اور مثالی مومن کا تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ یہاں ''نگارشات واقف'' سے صرف ایک اقتباس درج ہے، جو آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے:

''دنیا میں جب کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتی ہے تو اس کے سامنے امید بھی ہوتی ہے، مایوسی بھی ہوتی ہے، ناکامی بھی؛ لیکن مومن ایک ایسی شخصیت کا مالک ہوتا ہے، جس کی جدوجہد میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ امید وکامرانی ہی ہے، مایوسی اور ناکامی کی پرچھائی بھی اس پر نہیں پڑسکتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، اس کے لیے کرتا ہے کہ اس کے لیے یہی بات کامیابی نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے؛ بلکہ اس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدوجہد میں منہمک رہنا بجائے خود بڑی کامیابی ہے۔ وہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس لیے شروع نہیں کرتا ہے کہ کسی خاص منزل تک ضرور ہی پہنچ جانا ہے۔ اس کی ہار جیت کا معیار میدانِ جنگ نہیں ہوتا؛ بلکہ اس کی اپنی سعی وطلب ہوتی ہے''۔

حالی اور عہد حالی کا ذکر کرتے ہوئے واقف نے سینکڑوں صفحات میں اپنی علمی فضیلتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حالی فخر مشرق تھے، انہیں کسی دیار، کسی دیس، یا علاقے میں محصور کرنا فعل عبث ہے۔ ذیل میں بخوف طوالت ایک مختصر اقتباس نقل کررہا ہوں:

''حالی کا سمجھنا آسان نہیں ہے، حالی محض کسی مشہور شخصیت کا نہیں ہے، حقیقت امر یہ ہے کہ حالی اس عہد کا نام ہے، اس قومی مزاج کا نام ہے، اس عقیدہ کا نام ہے اور اس معاشرہ کا نام ہے، جو ایک صدی قبل ہندوستان میں جاری وساری تھا۔ حالی فخر مشرق تھے؛ لیکن یہ کہنا بھی ایسا ہے، جیسے زمین کی نصف آبادی دھوپ کی روشنی کو دیکھ کر یہ دعویٰ

کرے کہ آفتاب صرف ہمارا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی کسی دیس، کسی دیار، کسی ایک زمانے کے شاعر نہیں ہیں، ہر ملک، ہر مقام اور ہر عہد کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری زمان ومکان کی پابند نہیں، ان کی ادبی اقدار دائمی ہیں۔ زندگی کا ایک آفاقی کائناتی پیغام ہے۔ حالی اوران کا پیغام جغرافیائی منطقوں میں محصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے آفاقی کلام کے ہر نقطہ سے وسعت دائرہ مل سکتی ہے ...... ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہجرت کے بعد ہوتا ہے۔ حالی کی تخلیقی قوت پوری تیزی کے ساتھ ہجرت کے بعد دہلی میں ابھری اور جس شاعری کا آغاز ہوا وہ مستفید خاص سے متعلق تھا اور جس نے ہمیشہ جدید نظام حیات کے لیے راہیں ہموار کیں؛ لیکن حالی اس رمز کو بھی جانتے تھے کہ شاعری ساحری کا دوسرا نام ہے۔ وہ قوموں کو جگا بھی سکتی ہے اور سلا بھی سکتی ہے۔ وہ اقوام عالم کی انفرادی سیرتیں بگاڑ بھی سکتی ہے اور بنا سکتی ہے...... اس اصلاحی دور میں جو کچھ حالی نے لکھا، اس میں سادگی، سلاست، اصلیت، واقعیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ زبان بالعموم صاف وشستہ اور رواں ہوتی ہے۔ نگارشات علمیہ میں اکثر زبان کا انداز بدلا جاسکتا ہے؛ لیکن اصلاح پسند حالی نے عملی قدم اٹھا کر نئی نسل کی صحیح رہنمائی کی۔ نجی خط وکتاب میں بھی اس اسلوب کو پیش کیا اور پہلی بار اخلاقی شاعری کو فروغ دیا...... حالی طرز نوع کے خالق ہیں۔ افسر میرٹھی نے رسالہ 'نوبہار' میں مختلف واقعات ایسے پیش کیے جن سے حالی کی تخلیقات ادبی پر کافی روشنی پڑتی ہے...... حالی کی ہمہ گیر حساس طبیعت نے ہر شاعر اور ادیب کے حدیقہ سے استفادہ کیا؛ لیکن کبھی ابہام اور ذوالمعنین سے کام نہیں لیا۔ وسعت قلب سے ہمیشہ اپنے محسنین کو یاد رکھا...... شاعری کا جو نظریہ 'ورڈس ورتھ' نے پیش کیا تھا، ہندوستان میں حالی نے اس نظریہ شعر کو پیش کرنے کی جرأت کی ہے...... حالی پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے حسن کی تابناکی کو بنظر غائر دیکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ تعلیم دی کہ غزل میں عشقیہ مضامین ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں، جو دوستی ومحبت کے تمام جسمانی وروحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی نکتہ ایسا نہ آنے پائے، جس سے محبوب کی جنسی تحقیر ہو سکے۔ غزل میں ایسے مضامین ہونے چاہئیں، جن میں جوش ولولہ ہو، غم، یا مسرت ہو، یا ندامت شکر وشکوہ ہو، یا صبر وقناعت، رحم، یا انصاف، یا غصہ، یا تعجب، یا کہ امید وناامیدی، یا انتظار ہو، یا حب وطن ہو، گو اس امر سے انکار نہیں

کیا جاسکتا کہ غزل کا موضوع یکسر عشق ومحبت کے سوا کچھ نہیں''۔

مذکورہ اقتباسات واقف کی معلومات عامہ کے ساتھ فصاحت وبلاغت کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کا دلکش اندازِ بیان قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسلوب میں خواہ مخواہ کا تصنع اور عبارت آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے، جو نفس مضمون سے مضمون کو اتنی دور لے جائے، جہاں سے لوٹنے میں دشواری ہو۔ واقف نے ''نگارشات واقف'' میں ''طلسم ہوش ربا'' کا تاریخی اور تنقیدی مطالعہ جس طرح پیش کیا ہے، وہ اہل نظر سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتا:

> ''انسان بھی دریاؤں، پہاڑوں، ہواؤں اور موج ہوا کی طرح اپنے فطری ماحول میں رہتا ہے؛ لیکن انسانی فطرت کے دوسرے مظاہر میں ایک فرق ہے۔ دوسرے تمام مظاہر ایک دوسرے سے بے پروا ہوکر جی لیتے ہیں، یا کبھی کبھی مر بھی جاتے ہیں؛ لیکن انسان ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ دوسرے مظاہر سے بے پروا نہیں ہوسکتا۔ وہ انہیں اپنی زندگی میں سمو لینا چاہتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح مہک تو نہیں سکتا: اس لیے پھولوں سے عطر نکال لیتا ہے، پھر عطر کو محفوظ رکھنے کے لیے عطرداں بناتا ہے۔ یہ ہے تمدن کا پہیہ۔ پہاڑ جب اس سربلندی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ انہیں تراش کر اجنتاؤں کی تخلیق کرتا ہے۔ آبشاروں اور ندیوں اور ہواؤں کی گنگناہٹ سن کر وہ راگنیاں ایجاد کرتا ہے، ساز بناتا ہے اور شعر لکھتا ہے۔ یہ سماجی زندگی کا ارتقا اور فطرت کی کشمکش کی کہانی ہے۔ جب مرتا ہے تو فطرت کو خدا تسلیم کرلیتا ہے اور جب جیتا ہے تو چاند ستاروں پر جانے کی تیاریاں کرنے لگتا ہے۔ انسان اور فطرت کی یہی کشمکش ہماری جذباتی زندگی کی تعمیر کرتی ہے۔ لوک گیتوں اور کہانیوں میں یہی کشمکش سانس لے رہی ہے۔ اگر بادل نہ اُمڈتے اور کالی گھٹائیں نہ اُٹھتیں، اگر بجلی نہ چمکتی اور اگر بارش کے پہلے چھینٹے کالمس زمین کو یوں نہ گدگداتا کہ اس کے آنچل میں بھری ہوئی خوشبو بکھر جائے تو ہم کجری کے رسیلے بول نہ سنتے۔ سماجی زندگی کا ارتقا انسان کی اور فطرت کی کشمکش کی کہانی ہے۔ اب ہمارے سامنے پہلا سوال یہ ہے کہ طلسم کس جغرافیائی وحدت کی نمائندگی کرتا ہے؟ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ داستان فارسی میں لکھی گئی، یا اردو میں، اس وقت یہ بات بھی خالی از بحث ہے کہ داستان تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے، یا ترجمے کی، اس وقت تو طلسم کے علاقے کا تعین کرنا ہے''۔

(ب) صحافت

واقف نظریاتی طور پر جمعیۃ علماء ہند سے متاثر تھے، جس نے ملک میں دیگر تنظیموں کی طرح جنگ آزادی میں گرانقدر کارنامہ انجام دیا تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں وہ خود اور ان کا خاندان بھی سرگرم عمل رہا۔ کانگریس کو شروع سے اس خاندان کی حمایت بھی حاصل رہی اور آزادی کے بعد بھی وہ نظریاتی اور عملی طور پر کانگریس کے ساتھ رہے؛ لیکن واقف اس سے مستثنیٰ ہیں۔ زمینداری کے خاتمہ اور معاشی زوال انہیں پٹنہ لے آیا۔ وہ 'قلم کی مزدوری' کے علاوہ دوسرا کوئی کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ انتہائی زیرک اور حساس طبع واقع ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد ملک میں برسراقتدار کانگریس رہی اس کے باوجود اس کے دورِ حکومت میں اقلیتوں، پسماندوں اور دیگر طبقوں کے ساتھ ناروا سلوک سے وہ بہت متردد تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کی بعض داخلی و خارجی پالیسیوں کے بھی نکتہ چیں تھے۔ سرکاری تعلیمی، لسانی اور زرعی پالیسی سے بھی ان کا عدم اتفاق تھا، پھر ملک میں آئے دن رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات، ذات پات کی تفریقیں، نکسلی تشدد وغیرہ نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاست پر یک طرفہ کانگریس قابض و دخیل تھی، جس کے بعض سیاسی لیڈروں اور حکام کے عوام مخالف رویہ اور بدعنوانی سے عوام دوچار تھے۔ ان تمام پہلوؤں پر واقف کی تنقیدی نگاہ تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پٹنہ سے بے شمار اخبار شائع ہو رہے تھے۔ ان میں ایک آدھ کمیونسٹ اور سوشلسٹ نظریہ کا ترجمان تھا۔ باقی سبھی اخبار کانگریس نواز تھے۔ صرف روزنامہ ''سنگم''، پٹنہ جو بہار ہی نہیں پورے مشرقی ہندوستان میں اقلیتوں، مظلوموں، پسماندوں اور سیکولر طاقتوں کی آواز بھی تھا اور حکومت وقت کا شدید مخالف بھی۔ اس اعتبار سے ''سنگم'' کو ملک میں حزب مخالف کا سب سے موثر آلہ کار بھی سمجھا جاتا تھا، جس میں بڑے بڑے سیاست داں اور سیکولر دانشوران کے مضامین، بیانات اور خبریں شائع ہوتی تھیں، جن پر حکومت وقت کی گہری نگاہ رہتی تھی۔ ''سنگم'' کے لیے یہ دور بڑے ابتلا و آزمائش کا رہا، البتہ یہ واقف کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھا اور ''سنگم'' کو بھی ایسے باضمیر اور باصلاحیت صحافی کی ضرورت تھی، جو اس کے مشن کو آگے بڑھانے میں ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہو۔ سوئے اتفاق کہ اس زمانہ میں ایڈیٹر ''سنگم'' غلام سرور کو حکومت مخالف پالیسی کے الزام میں متعدد بار گرفتار ہونا پڑا۔ بقول غلام سرور:

''میری اور علامہ کی کوئی ملاقات نہیں تھی اور جب میں پہلی بار نظر بند ہوا، جب جیل کا آہنی دروازہ پشت پر بند ہو جاتا ہے تو ہمارے سامنے سارے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان کھل جاتے ہیں۔ اب واقعہ جو بھی ہو، لیکن جیل سے میں نے لکھا (سید شاہ مشتاق احمد صاحب کو) میری جگہ علامہ فضل امام واقف کو قائم مقام ایڈیٹر 'سنگم' بنایا جائے..... دس روپے لینے والا یہ شخص اس وقت 'سنگم' کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، جس وقت وہ دس لاکھ روپے لے سکتا تھا۔ واقف نے یہ سودا نہیں کیا، وہ چاہتا تو کرسکتا تھا۔ ایسے شخص کو خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہیے..... کلکتہ سے 'سنگم' کا جو ایڈیشن نکلا تھا، اس کی ادارت بھی انہیں کو سونپا''۔

(''ایک شام واقف کے نام'')

ان نامساعد حالات میں غلام سرور جیسے عظیم صحافی کی نگاہ انتخاب واقف پر پڑنا اردو صحافت کا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ غلام سرور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۲ء تک چھ بار جیل گئے۔ اس درمیان اخبار بار بار سرکاری عتاب کا شکار ہوتا رہا۔ اس اعتبار سے بھی بحیثیت ایک صحافی واقف کی ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی تھیں، اخبار کی پالیسی کے نقطۂ نظر سے بھی اور بھروسے کے لحاظ سے بھی۔ انہوں نے پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ وہ اخبار کے لیے اداریہ بھی لکھتے اور خبروں کی پالیسیاں اور حکمت عملی بھی طے کرتے۔ اگر چہ کسی اخبار کا اداریہ اس کے ایڈیٹر کا ہی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن جو لوگ واقف کے اسلوب سے آشنا تھے، وہ غلام سرور اور واقف کے اداریوں کا فرق بآسانی محسوس کر لیتے تھے۔ بیباکی اور جرأت مندی دونوں کا شانِ امتیاز تھا۔ یہ سلسلہ کوئی سال دو سال نہیں؛ بلکہ غلام سرور کی رہائی کے بعد بھی جاری رہا اور وہ عملاً ''سنگم'' سے ساری زندگی وابستہ رہے، جیسا کہ ڈاکٹر ریحان غنی لکھتے ہیں:

> ''یہ زمانہ غالباً ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۱ء کا ہے، علامہ گیارہ بجے دن میں ٹہلتے ہوئے اخبار کے دفتر آجاتے اور آتے ہی مجھ سے پوچھتے کہ آج کی اہم خبریں کیا کیا ہیں؟ میں انہیں کچھ اہم خبروں کی سرخیاں اور ان خبروں کے کچھ متن سنا دیتا۔ علامہ قلم سنبھال لیتے اور ٹہل ٹہل کر اداریہ لکھنا شروع کر دیتے، جب اداریہ مکمل ہو جاتا تو کاتب کے حوالے کر کے کھانا کھانے ہوٹل چلے جاتے۔ علامہ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ ان کی کوئی نثری تحریر ہو، یا شعری نگارشات وہ پروف پر پوری توجہ دیتے۔ کتابت کے وقت کاتب

نے فل اسٹاپ، کومہ، انورٹڈ کومہ کا خیال رکھا ہے، یا نہیں؟ اسے بغور دیکھتے اور نہیں ہوتا تو ناراض ہوتے اور ڈانٹ پلاتے''۔

(ریحان غنی کی زیر اشاعت کتاب سے)

اسی کے ساتھ انہوں نے متوازی طور پر ''سنگم'' میں 'واقف آرٹ' کا مخصوص کالم بھی جاری رکھا، جس کے مدیر خود لسان العصر علامہ سید شاہ فضل امام واقف ارولی آروی عظیم آبادی تھے۔ یہ سلسلہ ان کے انتقال کے بعد ختم ہوا۔ یہ مخصوص کالم ان کے افکار و خیالات کا بے لاگ ترجمان تھا۔ اس میں انہوں نے ان تمام امور کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا، جو بسا اوقات ایڈیٹوریل، یا دوسری خبروں میں ممکن نہیں تھے۔ اپنی ایسی تحریروں میں وہ کبھی کبھی حد سے تجاوز بھی کر جاتے تھے۔ حالات حاضرہ پر ان کے منظوم تبصرے حکومت وقت کی نگاہوں سے اوجھل نہ تھے۔ اگرچہ واقف کے خاندانی پس منظر اور ان کی علمی صلاحیتوں کے قائل بہار کے وزرائے اعلیٰ میں کے بی سہائے، داروغہ پرساد، بندیشوری دوبے، چندر شیکھر سنگھ، جگن ناتھ مشرا، عبدالغفور وغیرہ کے علاوہ متعدد وزرائے کابینہ بھی تھے۔ ان میں سے اکثر سے ان کے براہ راست تعلقات تھے؛ مگر واقف انہیں بھی اپنی تحریروں میں آئینہ دکھاتے رہے۔ آزادی کے بعد وہ کبھی عملی سیاست میں نہیں رہے؛ مگر ملکی و بین الاقوامی امور پر کھل کر اظہار خیال کرتے رہے اور بلاشبہ انہوں نے کبھی اپنے ضمیر کی آواز کو نہ دبایا اور نہ کسی طرح کی سودا بازی کی، خواہ کوئی سیاسی منصب کے اعتبار سے کسی بلند مقام پر ہی کیوں نہ فائز ہو، انہوں نے سب کی خبر لی۔

واقف کی صحافتی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ روزنامہ ''سنگم'' سے وابستہ رہا۔ ان کی دوسری حیثیت ایک فری لانسر جرنلسٹ کی بھی تھی۔ جب بھی کسی اخبار کے ایڈیٹر، یا مالک کو ضرورت پڑی واقف کی خدمات حاصل کیں اور وہ سبھوں کے کام آتے رہے۔ ویسے بھی اخبار کو زیادہ سے زیادہ مقبول، دلچسپ اور عوام پسند بنانے کے لیے ان کی نگارشات مختلف روزنامے اور ہفتہ واروں میں شائع ہوتے رہے۔

خانقاہ منعمیہ سے ۱۹۷۹ء میں جب ایک دینی، ملی و ادبی ماہنامہ ''المنعم'' کا اجرا ہوا تو اس میں واقف کی تحریریں اور شعری کلام کثرت سے شائع ہوتے رہے۔ اس مجلّہ کو ہر طرح سے پُر وقار اور معیاری بنانے میں ان کا بڑا عمل دخل تھا۔ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں اپنا ایک ہفتہ وار ''طشت از بام'' جاری کیا تھا، جس کی مدت اشاعت بہت کم رہی۔ غرض کہ خاموشی کے ساتھ بہار کے بے شمار اخباروں کے علاوہ مختلف ملی، مذہبی و رفاہی اداروں کے ترجمان کو سجانے، سنوارنے اور جاری رکھنے میں واقف نے گراں

قدر کارنامے انجام دیے۔ وہ اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ بحیثیت ایک صحافی میدان صحافت میں ہمیشہ متحرک وفعال رہے، مگر افسوس کہ بہار کی صحافت پر کام کرنے والوں نے انہیں فراموش رکھا۔ کچھ نہیں تو ایک طویل عرصہ تک پابندی کے ساتھ مدیر واقف آرٹ کے تحت انہوں نے صحافت کی، جو منظوم تاریخ رقم کی ہے، وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ ویسے انہیں اپنی ناقدری سے زیادہ ہم عصر صحافت کے انحطاط کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہاں صرف ان کے دو اقتباسات دیکھے جاسکتے ہیں:

''جرنلسٹوں کی دنیا میں قول وفعل کا تضاد اس وقت بھی تھا، جب بوالہوسوں نے حسن پرستی کا شعار اختیار نہیں کیا تھا۔ آبروئے شیوۂ اہل نظر آس پاس ہی موجود تھی، زیادہ دور نہیں دیکھی اور آج کا تو حال نہ پوچھئے۔ پٹنہ، کلکتہ، لکھنؤ، کانپور، دہلی ہر جگہ صحافت نگار سوسائٹی عرف ریڈیو ایڈیٹرس کانفرنس غالب کا مرقع چغتائی بن چکی تھی، جو ذرہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے''۔

(علامہ اقبال اور ایک طوائف)

''یہ سبزی باغ پٹنہ ۴ ہے، جہاں سے چھ روزنامے اور پینتالیس ہفتہ وار اخبار اور متعدد ماہنامہ رسائل نکلتے ہیں۔ بڑے، منجھولے، چھوٹے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر جوتوں اور چپلوں پر سوار فرش راہ بنے ہیں، جہاں بڑے بڑے شکمی جرنلسٹوں کے قلمی آپریشن پر عملی تجاویز کا خاکہ صرف اس لیے تیار کیا جاتا ہے کہ کہیں ڈبل ڈیلنگ کا باؤ گولہ عملی شکل نہ اختیار کرلے''۔

(کرکٹ کا پہاڑ)

جب کہ روزنامہ ''سنگم'' پٹنہ کی بے باکانہ صحافت کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے اسے یوں خراج تحسین پیش کیا ہے:

اگرچہ اردو صحافت ہے انحطاط پذیر
مگر ہے شکر کہ 'سنگم' کا ہے مقام اب بھی
ہے اس کے ذہن میں اب بھی تمیز باطل وحق
مئے حرام ہے اس کے لیے حرام اب بھی
رواں دواں ہیں مضامیں غلام سرور کے
کہیں قلم نہ ہوا اسپ بے لگام اب بھی

ہر ایک مضموں میں 'سنگم' کے تیر ونشتر ہے
مذاق اس کا ہے آئینہ عوام اب بھی
حسد سے جل اٹھا ہر بے ہنر صحافت کار
کہ اس کے گرد ہے پبلک کا اژدہام اب بھی
عوام کہتے ہیں 'سنگم' ہے مرغ آزادی
نہیں یہ طائر زیرک اسیر دام اب بھی

(ج) تصوف

اردو کی ابتدائی نشو ونما صوفیائے کرام کی رہین منت ہے۔ ملک کی شاید ہی کوئی ایسی خانقاہ ہو، جہاں اس کی اپنی لائبریری نہ ہو یا نہ رہی ہو۔ ایک زمانہ تک اس میں بے شمار نوادرات وتبرکات کے علاوہ مختلف علوم پر نایاب قلمی نسخے اور مخطوطات تھے، جن کی بدولت کئی محققین اپنا مقالہ علمیہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند سے سرفراز ہوئے اور بعض نے دنیائے تحقیق وادب میں ممتاز ونمایاں مقام حاصل کیا۔ خانقاہیں رشد وہدایت کے ساتھ تحریر وتصنیف کا بھی ایک اہم مرکز رہی ہیں، جن کی مطبوعات آج بھی قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں اور بطور حوالہ ان کا استعمال ہوتا ہے؛ لیکن فی زمانہ یہ ذوق کہیں ست روی کا شکار ہے تو کہیں بالکل ختم ہو گیا، البتہ اس اندھیرے میں اجالے کی کچھ کرنیں اب بھی باقی ہیں۔

جن لوگوں نے واقف کو ان کی زندگی کے آخری دور میں دیکھا ہوگا، انہیں وہ زیادہ سے زیادہ ایک درویش صفت انسان اور زود گو شاعر نظر آتے ہوں گے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی تعلیم شروع سے ہی مذہبی نہج پر ہوئی۔ افتاء میں سند یافتہ ہونے کے ساتھ عصری علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ درسی کتابوں کے علاوہ قرآن واحادیث اور فقہ وتفسیر پر ان کا سیر حاصل مطالعہ تھا۔ عربی، فارسی اور اردو زبان میں قرآن کی شاید کوئی ایسی تفسیر ہوگی، جو ان کی نگاہوں سے نہ گزری ہو۔ انہوں نے خود سورۃ العصر کی تفسیر لکھی تو علامہ ابن قیم، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالحمید فراہی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالحق حقانی سے لے کر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تک کی تفسیر وتفہیم کا حوالہ دیا؛ لیکن اس کے باوجود ان کی حیثیت کبھی مدرس، مفسر قرآن، یا خطیب وامام کی نہیں رہی۔ ان کی قرآن فہمی کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا سید شاہ اسماعیل روح نے کہا تھا:

''قرآن ان کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکا، انہوں نے باقاعدہ قرآن پر کوئی کام بھی نہیں کیا؛ لیکن قرآن کی آیات اور ان کا پس منظر ان کے حافظے میں ہے اور ضرورت کے مطابق وہ اسے نکال لیتے ہیں''۔

واقف نے تصوف کا بغائر مطالعہ کیا تھا، جس کا مآخذ قرآن و احادیث تھا؛ اسی لیے وہ اس راہ پر کسی اشکال کا شکار ہوئے بغیر آسانی سے چل پڑے۔ وہ امام غزالی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف اور ان کے افکار و خیالات سے بھی بے حد متاثر تھے۔ تصوف ان کے نزدیک شریعت کا حصہ تھی۔ اس کے اصطلاحات مثلاً علم لدنی، علم و یقین، معرفت و طریقت وغیرہ کو وہ عین اسلام قرار دیتے اور اس پر انگشت نمائی کرنے والوں کو دندان شکن جواب دیتے ہیں:

گالیاں دے کے تصوف کو ہوئے تم عریاں
کتنے ننگے ہو ذرا اپنا سراپا دیکھو

ان کے ذہن میں تصوف کا واضح مفہوم تھا۔ وہ اس امر کے بھی معترف تھے کہ جس طرح اسلام میں مختلف خرافات کی آمیزش نے اس میں بگاڑ پیدا کر دیا ہے، اسی طرح تصوف بھی ان سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ شاید اسی احساس نے ان سے ''صحیح العقیدہ صوفی مشرب نوجوانوں کا ترانہ حیات'' جیسی نظم لکھوائی:

لوح محفوظ ہیں، قرآن کی تفسیر ہیں ہم
قسمتیں جس سے لرزتی ہوں وہ تقدیر ہیں ہم
زندگی مقصدِ معمارِ حرم رکھتی ہے
سنگ بنیاد ہیں ہم ، قوم کی تعمیر ہیں ہم
اپنی ہر سانس میں ہے نغمہ وحدت کی صدا
روز و شب ، صبح و مسا نعرۂ تکبیر ہیں ہم
نالۂ نیم شبی ہو کہ فغانِ سحری
آہ جس قلب کی ہو، آہ کی تاثیر ہیں ہم
شام غم گیسوئے والعصر میں لیتی ہے پناہ
وقت کے پاؤں میں پڑتی ہوئی زنجیر ہیں ہم

صبح ماضی کی تجلی ہے نمایاں ہم سے
خواب مستقبل اسلاف کی تعبیر ہیں ہم
لشکر صوفیت اپنا ہے صف آرائے حیات
عکس آئینہ دل جوہر شمشیر ہیں ہم
کیوں بدل جائیں زمانہ کی طرح اے واقف
جو زمانہ کو بدلتی ہے وہ تدبیر ہیں ہم

واقف کے اس ترانہ میں قرآن کا عملی صوفی نوجوان، اس کا تصور وحدانیت، اس کی روحانیت، اس کا شیوہ نعرۂ تکبیر، اس کی نالہ نیم شبی اور اس کے ذہن میں سورۃ العصر کا انشراح، اس کے عزائم، اس کی تدبیر و عمل ــــ غرض یہ تمام محرکات مل ملا کر ایک صحیح العقیدہ صوفی مشرب نوجوان کا تصور پیش کرتا ہے، جو تصوف کی معرفت اور دین کا داعی ہے۔ یہ نظم فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے واقف کی شاہکار نظموں میں ہے، جس میں ایسا درد و سوز ہے جو وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ نظم معنی آفرینی اور فکر انگیزی کی بھی عمدہ مثال ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں تصوف کو دین سے الگ کوئی فکر اور عقیدہ نہیں کہا ہے؛ بلکہ وہ اسی تصوف کے قائل ہیں جو اسلام کے بنیادی ارکان میں شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

کبھی قرآں سے تصوف ہو الگ ناممکن
کھول کر آنکھ مگر حیرت موسیٰ دیکھو

پیام عمل ہے یہی ہر ولی کا
عبادت خدا کی ، اطاعت نبیؐ کی

مریدی لاتخف تفسیر لاخوف علیہم ہے
نظر کیوں جانب آیات قرآنی نہیں جاتی

حضور قلب جو شرط صلوٰۃ مومن ہے
کہاں ملے جو نہ ہوں دل کے پاسباں مخدوم

انہوں نے اپنے صوفیانہ افکار و خیالات کے لیے نظم و نثر دونوں کو وسیلہ اظہار بنایا؛ اس لیے

انہوں نے شاعری کے علاوہ اپنے مضامین میں تصوف سے متعلق اپنے عقائد ونظریات کی ترجمانی کی ہے۔ یہاں صرف دوحوالے دیکھے جاسکتے ہیں۔

واقف نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی شہرہ آفاق کتاب ''مکتوباتِ صدی'' کے ۳۳ ویں خط کا فارسی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے اوراس کی شرح بھی لکھی ہے، جس کی غرض وغایت انہوں نے یہ بتائی ہے کہ:

''اس مکتوب کا ترجمہ خود راقم الحروف کو کرنا پڑا، کیوں کہ دوسرے تراجم اضافہ وترمیم معنوی سے معمور نظر آتے ہیں''۔

وہ ''مکتوبات صدی'' کی افادیت واہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آج مراسلات کے ذریعہ ساری دنیا میں تعلیم کا رواج ہے۔ امریکہ، یورپ میں بڑی بڑی مواصلاتی یونیورسیٹیاں قائم ہیں۔''

''الہامات منعمی'' حضرت مخدوم شاہ منعم پاک قدس سرہ العزیز کی فارسی میں لکھی تصوف پر گرانقدر تصنیف ہے۔ جس کی ﴿فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شر یرہ﴾ کی شرح کی تشریح واقف یوں کرتے ہیں:

''شرح: عند الصوفیانہ خیالات، جذبات وافکار کو بھی اعمال کی حیثیت حاصل ہے؛ اس لیے اس آیت پاک سے استدلال فرمایا کہ جو ذرا سا خیر کرے گا، اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور جو ذرا سی شر کرے گا اس کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ علمائے ظاہر اس آیت پاک کی تفسیر انجام اور نتیجہ سے کرتے آئے ہیں؛ یعنی اچھے اور برے اعمال کے نتائج اور انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا؛ مگر صوفیائے کرام یعنی علمائے علم احسان اس کی وہی تفسیر کرتے ہیں، جو حضرت سیدنا مخدوم منعم پاک قدس سرہ نے فرمائی۔

عزیز من! اے میرے عزیز! ہر شخص کی جنت اور دوزخ کی وسعت اس کے اعمال اور عرفان کے پھیلاؤ کے مطابق ہے۔

شرح: یعنی جس کی معرفت قرآن، معرفت رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم معرفت ذات وصفات وافعال خداوند عز اسمہ جل جلالہ معرفت قرآن حکیم، معرفت احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم، معرفت صلوٰۃ، معرفت تسبیح، معرفت تحمید، معرفت تہلیل، معرفت اطاعت

نبی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، معرفت اطاعت اولی الامر، یعنی معرفت ائمہ دین ومشائخ طریقت جتنی وسیع ہوگی، اس کی جنت بھی اسی وسعت کے تناسب سے وسیع ہوگی۔ معرفت منکرات ومعاصی، معرفت کبروغرور، معرفت رشک وحسد، معرفت بغض وعناد، معرفت کفر وشرک، معرفت اتباع خطوات الشیطان جتنی وسیع ہوگی۔ العیاذ باللہ''۔

''علم'' کسی چیز کو جاننا ہے۔ آپ نے تاج محل آگرہ نہیں دیکھا؛ مگر کتابوں میں پڑھا، بہ کثرت لوگوں سے سنا، اس تواتر کے ساتھ سنا کہ دل میں کیفیت یقین پیدا ہوگئی۔ اس کا نام 'علم الیقین' ہے اور یقین کہتے ہیں، اس کیفیت کو جو کسی مشکک کے شک دلانے سے زائل نہ ہو۔

اس سے اونچا مرتبہ ہے 'عین الیقین'۔ ذہن میں 'تاج محل' کے جو خاکے بنائے تھے مٹ گئے، اب صحیح تصور ذہن میں تاج محل کا پیدا ہوگیا، اس کو 'عین الیقین' کہتے ہیں۔

اچھا آپ آگرہ پہنچ گئے، آپ نے اپنی آنکھوں سے تاج محل کو دیکھ لیا۔ اس مرتبہ 'عین الیقین' کا تصویر دیکھ کر جو تصور پیدا ہوا تھا، بالکل بدل گیا۔ یہی مرتبہ 'حق الیقین' ہے اور اسی کا دوسرا نام عندالصوفیہ 'معرفت' ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گناہگار گناہوں کے اس آخری مرتبہ پر پہنچ گیا ہو اس کی معلومات شیطان کی وسعتوں کا کیا پوچھنا مگر اس کی یہی عملی وسعت معلومات دوزخ کی وسعت بن جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنی چاہیے''۔

(ماہنامہ 'المنعم'، پٹنہ اکتوبر نومبر ۱۹۸۰، ص: ۹-۸)

تصوف پر ہی واقف اپنے ایک تنقیدی وتجزیاتی مضمون ''تلبیس ابلیس: تجدید دین کی نقاب میں'' میں مولانا وحید الدین خاں کی کتاب ''تلبیس ابلیس'' کے صفحہ سولہ کا حوالہ دیتے ہیں، جس کا ایک مختصر اقتباس درج ذیل ہے:

''اس سلسلے میں دوسری چیز وہ ہے جس کو تصوف کہتے ہیں۔ پہلا شخص جس کو اسلام کی تاریخ میں صوفی کے لفظ سے پکارا گیا، غالباً ابو ہاشم الصوفی (۱۵۰ھ) تھے، تاہم اس وقت تک صوفی کے معنی صرف یہ تھے، وہ شخص جو زاہد اور عبادت میں غلو کرے، چوں کہ یہ لوگ اچھے لباس کو چھوڑ کر صوف (اون) کے معمولی کپڑے اپنے جسم پر لپیٹ لیتے تھے؛ اس لیے ان کو صوفی کہا جانے لگا، اس کے بعد اس کے قواعد اور اصطلاحات بننے لگے، یہاں تک کہ تیسری صدی

ہجری میں پہنچ کر تصوف نے اسلامی روحانیت کے باقاعدہ فن کی شکل اختیار کرلی۔ اشراقی فلسفہ رہبانیت اور ویدانت میں اس کے لیے کافی مواد تھا۔ اس طرح مختلف بیرونی عناصر کی مدد سے ایک ایسی چیز وجود میں آئی، جس پر اگرچہ اسلام کا لیبل لگا ہوا تھا؛ لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک متوازی مذہب تھا، جو اسلام کے اندر اسلام کے بالمقابل بنایا گیا"۔

مذکورہ اقتباس پر واقف کا تجزیاتی وتنقیدی جائزہ ملاحظہ فرمائیں:

"مولانا وحید الدین خاں کی کورچشمی اور دیدہ دلیری اسلام کے سب سے پہلے صوفی کو بھی نہیں پہچانتی؛ مگر جن کے دلوں کو اللہ نے ایمان کی روشنی عطا فرمائی، وہ قرآن کے اوراق میں اسلام کے سب سے پہلے صوفی کو دیکھتے ہیں اور بے ساختہ درود پڑھتے ہیں۔

یہ مزمل صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ کملی اون کی نہیں ہوتی تو کس چیز سے بنتی؟ سورہ مزمل شریف اسلام کی درویشی کا مکمل ہدایت نامہ ہے کہ دنیا سے اگر تصوف کی ساری کتابیں بھی العیاذ باللہ ناپید ہوجائیں تو سورہ مزمل شریف درویشوں کے لیے اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات میں کافی ہیں، ﴿واصبر مایقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً﴾ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لوگ آپ کو کہتے ہیں اس پر صبر فرمایئے اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے علاحدہ ہوجایئے۔ ہر دور کے صوفی کا عمل اس پر رہا اور آج بھی جہاں حقیقی صوفی موجود ہیں، اس پر عمل پیرا ہیں۔ کملی والے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی کملی کو جن بزرگوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، انہیں قرآن ﴿فاتبعونی یحببکم اللہ﴾ کہہ رہا ہے۔ بہ نیت اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ جانے والے اللہ کے محبوب ہیں۔ خدا کہہ رہا ہے، جل جلالہ وعم نوالہ؛ مگر عقل وایمان کے اندھوں کو نہیں سوجھتا۔

مولانا وحید الدین نے اشراقی فلسفہ کا صرف نام سنا ہے، اس کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیوں نے فلسفہ اشراق کو مردود قرار دیا اور شیخ الاشراق شہاب الدین کو مقتول کہا جاتا ہے، انہیں کوئی صوفی یا عالم اہل سنت والجماعت شہید کہنے کو بھی تیار نہیں ہے اور مولانا وحید الدین خاں کے مورث اعلیٰ ﴿ثم استوی علی العرش﴾ کی آیت سے خدا کی جسمانیت کے قائل ہوئے اور اسلام میں فرقہ مجسمیہ کی بنیاد رکھی، جو اشراقیت اور رہبانیت اور ویدانت سے بھی زیادہ گمراہ کن ہے تو انہیں صوفیا کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ذرا ہوش وحواس سے کام لینا چاہیے تھا۔

کہاں کی رہبانیت؟ کیسی رہبانیت! شرح عقائد نسفی میں ساری دنیا کے اہل سنت والجماعت یہ پڑھتے اور پڑھاتے آئے کہ نحن نعتقد عن طریق الجنید وأصحابه طریق متقوم (ہم اہل سنت والجماعت یہ اعتقاد بھی رکھتے ہیں کہ جنید بغدادی اوران کے اصحاب کا طریقہ قرآن وسنت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے)۔

کیا مولانا وحید الدین خاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ معین الدین چشتی رحمہما اللہ علیہم راہب تھے، گمراہ تھے، کوئی متوازی اسلام لے کر چل رہے تھے۔ فلسفہ اشراق اور ویدانت فلاسفی کی صدائے بازگشت تھے، اپنے بیان کی توسیع کرتے ہوئے واقف آگے لکھتے ہیں:

''علم حدیث کی طرح علم طریقت بھی روایتاً سند متصل امت تک پہنچا ہے۔

مولانا وحید الدین خاں صاحب کو خانوادہ ہائے طریقت پر حملے سے پہلے محدثین کرام کی روایتوں کے حصار کو مدنظر رکھنا چاہیے تھا۔ روایتوں اور اسناد پر جرح وتنقید کا جو معیار بھی وہ مقرر فرمائیں، صوفیوں کے شجرہائے طریقت اس معیار پر پورے اتریں گے اور محدثین کرام، جنہیں خاں صاحب نے پڑھا تو ہے سمجھا بالکل نہیں، ابھی اسماء الرجال، کی بحث وجرح سے بھی آزاد نہ ہو سکے۔ غالباً مولانا وحید الدین خاں اس کو پسند نہیں فرمائیں گے کہ محدثین کے خلاف مولانا تمنا عمادی پھلواروی کی خرافات کو شائع کردیا جائے اور اس کے اصول حمہ پر از سر نو بحث کا آغاز ہو جائے، آپ علم لدنی کو احادیث نبویہ سے علاحدہ سمجھتے ہیں اور صوفیائے کرام پر طنز وتعرض کے تیروں کی بوچھار کرتے ہوئے وہ سب کچھ لکھ جاتے ہیں..... ذرا سورۂ کہف تو اٹھا کر دیکھئے:

﴿وعلّمنه من لّدنا علماً﴾ قرآن کی یہ آیت ہے، یا نہیں؟ علم لدنی قرآن کا ایک حصہ ہے، جو حضور سید الانبیا والمرسلین کو عطا کیا گیا۔

ویعلمهم الکتاب والحکمة میں حکمت سے یہی علم لدنی مراد ہے، جس کی تعلیم سند بہ سند صوفیائے کرام میں چلی آئی ہے۔ اس علم میں فقہ کی طرح اجتہادات بھی ہوئے اور ہر سلسلہ اپنے مجتہد طریقت کے نام سے منسوب اور مشہور ہوا''۔

(ماہنامہ 'المنعم'، پٹنہ، دسمبر ۸۹ء، جنوری ۱۹۸۰ء ص: ۲۳-۲۵)

مندرجہ بالا اشاروں سے واقف کا تصوف کے سلسلہ میں عقیدہ اور مطالعہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

واقف عظیم آبادی

واقف: ایک اجمالی جائزہ

مختلف علوم وفنون پر کمال رکھنے والے صاحبِ طرز شاعر اور انشا پرداز علامہ سید شاہ فضل امام واقف جیسے نابغۂ روزگار برسوں نہیں، صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عالی نسب تھے اور نجیب الطرفین سید تھے۔ گلابی رنگت، بارعب آنکھیں، پرنور چہرہ، پاٹ دار آواز ان کی شخصیت کو چار چاند لگاتی تھیں۔ ان کا تعلق غیر منقسم ہندوستان کے اس ذی علم اور متمول گھرانے سے تھا، جو کئی اعتبار سے آج بھی معروف وممتاز ہے۔ اگرچہ واقف کی علمی وادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں؛ مگر ستم ظریفیٔ زمانہ کہ ان کی غیر معمولی فتوحات کو اب تک وہ مرتبہ ومقام نہیں مل سکا، جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان کی طبعی بے نیازی اور خود فراموشی کا بھی اس میں کسی حد تک دخل ہے۔ انہوں نے اپنی سیاسی وسماجی، یا شعری وادبی حیثیت منوانے کے لیے کسی کا سہارا نہیں لیا۔ سچ ہے کہ انہیں شہرت ونا موری کبھی پسند نہیں تھی، جب کہ حقیقت ہے کہ وہ گونا گوں اوصاف کے حامل اور مختلف اصناف نثر ونظم پر کمال رکھنے والے فنکار تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے جو شعری وادبی اثاثہ چھوڑا ہے، وہ ہمارے ادب کا قیمتی ورثہ ہے۔ میرے علم کے مطابق ان کی حیات وخدمات کے حوالے سے اب تک کوئی جامع کتاب منظر عام پر آئی ہے، نہ کوئی قابل ذکر تحقیقی کام ہوا ہے؛ (صرف ایک مقالہ علمیہ بہار یونیورسٹی میں جمع ہوا تھا، جس پر ڈاکٹریٹ کی سند عطا ہوئی ہے) تاہم ان کی صحافتی خدمات جس کا بہت بڑا حصہ 'واقف آرٹ'، 'طنز وتغزل'، حالاتِ حاضرہ پر منظوم تبصرہ اور دیگر مضامین پر مشتمل ہیں، ان کے علاوہ 'نگارشاتِ واقف' کے ہزاروں صفحات وہ عظیم الشان کارنامہ ہے، جو ان کی شہرت اور بقائے دوام کی ضمانت ہے۔

جہاں تک واقف کی کلاسیکی شاعری کا تعلق ہے، بجا طور پر انہوں نے خود کو اقبال، جگر، سیماب، صائب وغیرہ کی صفوں میں شمار کیا ہے۔ ان کا کلام ان کے اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے، البتہ 'طنز وتغزل' اور 'واقف آرٹ' میں ان کی حیثیت موجد، مجتہد اور خاتم کی ہے۔

ہجو نگاری ان کا پسندیدہ موضوع رہا، جس سے انہوں نے بڑا کام لیا، ان کی اس نوع کی شاعری نے جہاں وقت کی رفتار پر قدغن لگایا، وہیں اپنے عہد پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔ اہل سخن نے ان کے کمال سخن کی پذیرائی اور ذہن رسا کی ستائش کی ہے۔

واقف کی شاعری میں جابجا عوامی بہبود اور انسان دوستی کا جذبہ موجزن ہے؛ لیکن یہ ان کے فن اور سماجی شعور پر کبھی غالب نہیں آسکا، انہیں اپنے موضوع سے گہری وابستگی اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شہر آرا میں ایک محلہ کا نام 'تری' ہے۔ وہاں کے ایک شاعر نے کسی مشاعرہ میں جب اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا:

ذرا اے ناخدائے عشق میری رہبری کرنا
ہجومِ یاس میں واماندگی محسوس ہوتی ہے

تو شاعر کے محلہ 'تری' کی مناسبت سے 'محسوس ہوتی' ہے اور 'معلوم ہوتی' ہے کے باریک فرق کو واقف نے جس برجستگی سے اپنے دو اشعار میں واضح کیا اور شاعر کی زبان دانی کو جس لطیف انداز میں ہدف بنایا، وہ انہیں جیسے سخن شناس کا حصہ ہے۔ شعر دیکھئے:

یہی اک بات ہے جو اس گھڑی محسوس ہوتی ہے
کہ خامی حاصل صد پختگی محسوس ہوتی ہے
'تری' میں رہنما اور ناخدا خشکی میں کیا کہنا
مجھے واماندگی بھیگی ہوئی محسوس ہوتی ہے

ان کی اس طرح کی مثالوں سے مشاعروں کی یادیں اور شعری گلدستے بھرے پڑے ہیں، بعض کے عینی شواہد ابھی بھی موجود ہیں۔

واقف کی شاعری کا ایک اہم موڑ 'واقف آرٹ' ہے، جو اردو اخباروں کے صفحات کی ایک عرصہ تک شان بڑھاتا رہا۔ یہ ان کے پختہ سیاسی و سماجی شعور اور زندگی کے آلام و مصائب کا اشاریہ ہے۔ 'واقف آرٹ' ایک مدت تک علمی و ادبی حلقے میں مقبول اور ذہنوں کو مہمیز کرتا رہا۔ یہاں تک کہ برسہا برس حکمراں طبقہ بھی اس سے متاثر رہا۔ حزب مخالف کے لیے تو یہ مخصوص اور کارآمد نسخہ تھا ہی، انفرادی طور پر بھی لوگوں کو 'واقف آرٹ' کے تحت منظوم کلام کی وقتاً فوقتاً ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اس

کی مدد سے ہندوستان کے پچاس سالہ ادبی وشعری، سیاسی وسماجی نشیب وفراز کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس آرٹ نے انہیں معاشی طور پر بھی سہارادیااور ان کی مقبولیت کا سبب بھی ہوا۔ 'واقف آرٹ' سے صرف چند اشعار پیش ہیں:

مجھے بتائیں گے عزت مآب انصاری
خرد جنوں سے جو ٹکرا گئی تو کیا ہوگا
نسیم صبح وزارت ہے آج خواب آور
کہیں نصیب کو نیند آگئی تو کیا ہوگا
میں جانتا ہوں کہ گیسوئے یار پرخم ہے
خودی کی زلف بھی لہرا گئی تو کیا ہوگا
نہ سوچئے کہ قیامت بھی آنے والی ہے
یہ سوچئے کہ اگر آگئی تو کیا ہوگا

طبیعت بادہ نوشوں کی جواں معلوم ہوتی ہے
عطا کچھ آپ کی پیر مغاں معلوم ہوتی ہے
اگر گم کردہ راہ گلستاں معلوم ہوتی ہے
نسیم صبح کی آمد گراں معلوم ہوتی ہے
محبت کی کسک دل سے ابھر آئی ہے آنکھوں میں
نہاں محسوس ہوتی تھی عیاں معلوم ہوتی ہے
کوئی آواز ہو کوئی صدا ہو کوئی نغمہ ہو
ہمارے کعبۂ دل کی اذاں معلوم ہوتی ہے
شکایت ہے کسی کی شوخیٔ تحریر کی واقف
تری تصویر نقشِ رائیگاں معلوم ہوتی ہے

'واقف آرٹ' کی تمام خوبیوں کے علاوہ اس کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ اس کی روشنی کی چکا چوندھ کے سامنے واقف کی سخنوری کے دوسرے انتہائی روشن باب ماند پڑ گئے، یہاں تک کہ ہماری نئی نسل تو کجا واقف کے معاصرین کی اکثریت کی نگاہیں بھی طنز و تغزل اور واقف آرٹ سے اوپر نہیں اٹھتیں، جس کے سبب اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے دوسرے جواہر پارے کہیں پردۂ خفا میں نہ چلے جائیں۔ ان خدشات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اگر بہت جلد باقیات واقف کی ترتیب وتدوین نہیں کی گئی تو ان کی کلاسیکی شاعری اور نثر نگاری کے ساتھ دیگر بیش قیمت نگارشات بھی معدوم ہو سکتی ہیں۔ اس طرح واقف کے ساتھ انصاف تو دور ہم اپنی ادبی وراثت کا گلا گھوٹنے کے جرم کے مرتکب بھی ہوں گے۔

واقف کی کلاسیکی غزلیں اور سنجیدہ نظمیں فنی وفکری اعتبار سے انتہائی بلند درجات کی حامل ہیں۔ ان میں بعض ملکی وغیر ملکی صورتحال کا وہ اشاریہ ہیں جن سے بار بار رجوع کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان سے کسی شاعر کی ندرتِ سخن اور اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ معیاری اور سطحی شعر میں کس طرح تمیز کی جائے، شعر صرف کلام موزوں کا نام نہیں؛ بلکہ اس میں مختلف صنعتوں کو بخوبی برتنا اچھے اور اعلیٰ فنکار کا کمال ہے۔

واقف کے یہاں وجد و کیف میں ڈوبا ہوا عارفانہ کلام، حب رسولؐ سے سرشار نعتیں، عقیدت ومحبت کے جذبات سے بھرپور سلام، منقبت اور نوحے اور اولیائے کرام و بزرگانِ دین کی شان میں کہے گئے قصائد، ان کے جوش ایمانی، طہارتِ قلبی اور ان کی الہامی کیفیت کا نتیجہ ہیں؛ مگر رفتہ رفتہ یہ سرمایہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے قبل کہ یہ ادبی سرمایہ آثارِ قدیمہ کے ذیل میں آجائے، اس قیمتی اثاثے کی بازیافت اور ان کی تدوین و ترتیب بھی وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔

واقف کے متقدمین اور معاصرین میں متعدد قابل قدر شعرا ایسے گزرے ہیں، جن کی نثری خدمات بھی وقیع ہیں؛ مگر واقف نے اپنی نثری تخلیقات کا جو بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے، اس سے علم وادب کا ایک بڑا حلقہ ناواقف ہے۔ ان میں بعض واقف کے فوری ردِ عمل کا نتیجہ ہیں، جو محض اخبار تک محدود رہے، البتہ 'نگارشاتِ واقف' وہ بحرِ زخار ہے، جس میں علم وادب، شعر و سخن، تاریخ و سیاست اور ملک و ملت کی کئی ندیاں آکر ملتی ہیں۔ یہ تذکرہ، تحقیق، تنقید، تاثر، تبصرہ، تہذیب، تمدن، سیرت،

سوانح، سیاست، شخصیت، ملک، مذہب، ملت، ادب، صحافت ـــ غرض ایسا سرچشمہ ہے، جس کے بے شمار سوتے 'نگارشاتِ واقف' میں پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، پھر انہوں نے خالص تنقیدی مضامین بھی لکھے، جس میں انہوں نے عملی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ کلام کے حسن و قبح اور ان کے عیوب و محاسن پر بھی مفصل روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

''بہترین شعر وہ نہیں، جو فلسفہ ہو؛ بلکہ بہترین شعر وہ ہے، جو دعوتِ فکر ہو، جو اتنا خیال انگیز ہو کہ ذہن کے سانچے خود بخود بدل جائیں''۔

''جو شعرائے کرام کسی ایک صنف سخن، یا دو چار اصناف سخن میں محدود رہے، انہیں شاعر کہنا تکلف سے خالی نہیں ہے۔''

واقف کی نثر کے یہ وہ انمول جواہر ہیں، جن سے بحث کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ انہوں نے کوچۂ تصوف میں بھی قدم رکھا اور اس باب میں بھی اپنی شاعری اور نثر پر مشتمل قیمتی سرمایہ چھوڑا؛ لیکن یہ بھی منتشر ہیں۔

واقف کی شخصیت، ان کا شاندار ماضی اور دردناک مستقبل، ان کی شاعری کی مختلف جہات اور مختلف النوع نثری تحریریں تفصیلی مطالعہ کا تقاضہ کرتی ہیں، اگرچہ ان پر چند کتابیں اور تقریباً نصف درجن مضامین شائع ہو چکے ہیں؛ لیکن ابھی بھی ان کی شخصیت اور فکر و فن کے تعین کا کام ابتدائی مرحلہ میں معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے طنز و ظرافت کے تعلق سے میر، غالب، سودا، حالی، اکبر اور اقبال وغیرہ کے کلام کا جس طرح جائزہ لیا ہے اور اپنی بے باکانہ رائے دی ہے، اس سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک صحافی کی حیثیت سے واقف کی خدمات اور حالاتِ حاضرہ پر ان کا جرأت مندانہ نثری و شعری اظہار کی جادوگری نے ان کے قارئین کو شاید اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ ان کے دوسرے اصناف پر بھی توجہ دیتے۔ یہی ان کے مرتبہ و مقام کے تعین میں بہت حد تک رخنہ کا سبب بھی ہے۔ بیک وقت وہ اتنے سارے موضوعات اور اصناف پر لکھتے رہے کہ ان کے قارئین کے لیے یہ انتخاب مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا کہ ان کی ترجیحات کیا ہوں؟ پھر ان کی فقیرانہ زندگی، درویشانہ انداز، قلندرانہ زیست، خلافِ معمول عادتیں بھی ایک زمانہ تک لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہیں اور برسہا برس یہی عوامل ان کے تعلق سے موضوعِ بحث رہے۔ کوئلے کی راکھ سے ان کا شغل، دنیا سے بے نیازی اور

اپنے حال میں مست رہ کر انہوں نے یہ دکھلا دیا کہ صرف اللہ کے بھروسے کیسے جیا جا سکتا ہے، وہ بھی جس کا ماضی انتہائی شاندار؛ بلکہ شاہانہ رہا۔ وہ مجلسی آدمی تھے، خود میں ایک انجمن تھے، جہاں صاحبِ اقتدار طبقات سے ان کے روابط تھے، وہیں صحافت وادب اور شعروسخن کے نامور لوگوں سے بھی ان کے دیرینہ تعلقات رہے ـــــــــــ غرض واقف کی نفسیات اور شخصیت کے نوع بہ نوع پہلو، ان کی زندگی کے نشیب وفراز، ان کا علم وآگہی، ان کی سیاسی وسماجی بصیرت سے لے کر ان کی تنہائیوں کے شب وروز ایسے پہلو ہیں، جنہیں مطالعے کے دائرے میں سمیٹنا اور تحریر میں لانا ایک مشکل امر ضرور ہے؛ لیکن انہیں ضبط تحریر میں لانا وقت کا اہم تقاضہ ہے؛ کیوں کہ مزاج کی تندی وترشی کے باوجود پچاس ساٹھ سال تک ان کی شخصیت لوگوں کے لیے کشش اور توجہ کا باعث رہی۔

لوگ واقف سے بڑی محبت کرتے تھے؛ لیکن اس محبت کے تقاضے کا حق اسی وقت ادا ہوگا جب کلیاتِ واقف کی تدوین اور ان کی بکھری اور پھیلی ہوئی نثری تحریروں کی ترتیب کا جوکھم اٹھانے کا کام سرانجام دیا جائے، مگر سوال ہے یہ کام کرے کون؟

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے



انتخاب کلام

غزلیں

[۱]

پڑھو اس کو تمہارے واسطے کیا کیا لکھا میں نے
کتاب دل لکھی ، اک دفتر معنی لکھا میں نے

رعایت لفظ و معنی کی نہ ہو تو شعر مہمل ہے
وہاں ساحل بھی دیکھو گے جہاں دریا لکھا میں نے

مرے اشعار میں منظر کشی بھی ہے ظرافت بھی
قلم نے کھینچ دی تصویر جو خاکا لکھا میں نے

ہر اک 'برننگ ٹاپک' پر لکھا میرے سوا کس نے؟
جو لکھا وہ بہ رنگ آتش صحرا لکھا میں نے

زبان سادہ میں رنگینیاں رکھ دیں سیاست کی
مزا آنے لگا دونوں کو جب یکجا لکھا میں نے

شگفتہ طبع ہوں ہر رنگ ہے باغ و بہار اپنا
ہر اک مضمون خار و گل تر و تازہ لکھا میں نے

مرے اشعار میں ہے جا بہ جا آہنگ صائب بھی
دلیل اس کی وہیں لکھ دی جہاں دعویٰ لکھا میں نے

مرے اشعار میں ہے بلبل شیراز کا نغمہ
بہت رنگیں لکھا ؛ لیکن بہت سادہ لکھا میں نے

مخالف میرے کہتے ہیں کہ میں 'ہزال و پاجی' ہوں
اسے 'سفلہ' لکھا میں نے اسے 'غنڈہ' لکھا میں نے

حقیقت اس میں صرف اتنی سی ہے اے دوستو سن لو
جو بے ہودہ تھا اس موذی کو بے ہودہ لکھا میں نے

مگر جو لوگ اچھے ہیں بڑھایا حوصلہ ان کا

بانگ صور اسرافیل انہیں اچھا لکھا میں نے
وہیں 'ماضی' سے جوڑا ذہن کا ٹوٹا ہوا رشتہ
اگر 'امروز' کو وابستہ 'فردا' لکھا میں نے
مدد مانگی خدا سے اور ہر مضمون کو واقف
قلم برداشتہ لکھتا ہوں برجستہ لکھا میں نے

[۲]

ہے 'مین از اے مسٹری' کا مسئلہ نہ پوچھئے
جو ہورہا ہے دیکھئے جو ہوگیا نہ پوچھئے
ہر ایک چیز ہے گراں مگر زبان یار پر
کہاں یہ اس کا نام ہے کہاں پتہ نہ پوچھئے
'مسائل حیات' سے گریز ہر سخن میں ہے
'وزیر بے ثبات' کا یہ ماجرا نہ پوچھئے
ہے 'آر ایس ایس' آج بھی 'قدم قدم بڑھے چلو'
کہاں سے اس کے دل میں ہے یہ حوصلہ نہ پوچھئے
'شکست خوردہ ذہنیت' کا ایک 'رہنما' ملا
کہا کہ کچھ بتایئے! وہ بول اٹھا نہ پوچھئے
یہ روس ہے، وہ امریکہ، یہ میں ہوں اور وہ آپ ہیں
ہے کون کس کی 'دم' میں اب بندھا ہوا نہ پوچھئے
تنازع للبقا کا غل فضائے شیطنت میں ہے
لڑو، بھڑو، کٹو، مرو کا فلسفہ نہ پوچھئے
کھڑے ہوئے ہیں قبلہ رخ امام و مقتدی مگر
ہے دو دلوں کے درمیاں جو فاصلہ نہ پوچھئے
ملی جلی حقیقتوں کا نام 'واقف آرٹ' ہے
الگ الگ نہ پوچھئے جدا جدا نہ پوچھئے

[۳]

یہ کوشش تھی کہ سعی رائیگاں اچھی سے اچھی ہو
اڑے لیکن یہ گرد کارواں اچھی سے اچھی ہو

میاں مجنوں تھرکتے ہیں کہ ہے محمل نشیں لیلیٰ
حدی خوانی ذرا اے سارباں اچھی سے اچھی ہو

کہا اک نیچری نے کل کہ نیچر کا تقاضہ ہے
بہار اچھی سے اچھی ہو خزاں اچھی سے اچھی ہو

کہا چھمن نے میں بنیا ہوں گُر کی بات کہتا ہوں
کہ مٹی بیچ دوں لیکن دکاں اچھی سے اچھی ہو

اسی مجلس میں اک شاعر بھی تھے کہنے لگے مجھ سے
کہ مضموں کچھ بھی ہو حضرت! زباں اچھی سے اچھی ہو

وہیں پر اک 'نمازی' تھے وہ بولے سب نمازی ہوں
جو ہو 'روح بلالی' اور اذاں اچھی سے اچھی ہو

بقول حضرت رومی ہے سرّ دلبراں خوشتر
مگر دیکھو! حدیث دیگراں اچھی سے اچھی ہو

کہا تھا مرنے والوں نے سنا تھا جینے والوں نے
تن خاکی میں جان ناتواں اچھی سے اچھی ہو

ہے 'سارے گاما پادھانی سا گا گائے سا' کا ہنگامہ
کہ تکمیل مذاق شاعراں اچھی سے اچھی ہو

ہمیشہ ہر سیاسی پارٹی کو فکر رہتی ہے
کہ اخباروں میں اس کی داستاں اچھی سے اچھی ہو

سنو اے شیخ عبداللہ! تھے اقبال کشمیری
خودی کہتی ہے کشت زعفراں اچھی سے اچھی ہو

[۴]

ہندو نظر آئے نہ مسلماں نظر آیا
ہر کفر یہاں حاصل ایماں نظر آیا

ہر زلف یہاں زلف پریشاں نظر آئی
ہر خواب یہاں خواب پریشاں نظر آیا

کرنے لگا مجھ سے 'سیکولرازم' کی باتیں
اچھا مجھے وہ تا حد امکاں نظر آیا

جو ہوش میں تھے ان کو تھی ہر راہ میں مشکل
مستوں کو ہر اک راستہ آسان نظر آیا
تیرے 'ایٹمک ایج' سے جب دل مرا ٹوٹا
یہ ذرۂ ناچیز بیاباں نظر آیا
اس مرد برہنہ کو بھی تنقید کی سوجھی
مجنوں کو مرا چاک گریباں نظر آیا
آجاتی ہے اخبار سے 'گپ' میں مری وسعت
مجھ کو یہ 'ٹیبل ٹاک' کا ساماں نظر آیا
بے کار ہے، لایعنی ہے دیکھا اے شب تاریک
جگنو سے جو صحرا میں چراغاں نظر آیا

[۵]

لطف ستم ہے قتل مکرر ہے واہ واہ
میرے گلے پہ آپ کا خنجر ہے واہ واہ
آئے ہیں آپ زلف پریشاں کئے ہوئے
گیسوئے انقلاب معطر ہے واہ واہ
کرتے ہیں آپ 'غول بیاباں' کی رہبری
شیطاں بھی جس کو دیکھ کے ششدر ہے واہ واہ
'مستقبل قریب' سے 'ماضی' بعید ہے
'دنیائے حال' برصف محشر ہے واہ واہ
'آئین عدل' عضو معطل ہے آج کل
لے دے کے ساری بات برابر ہے واہ واہ
ہے 'آمد بہار' میں 'آورد نوبہ نوٗ'
باد نسیم تابع صر صر ہے واہ واہ
دیوانہ جوش میں ہے نہ فرزانہ ہوش میں
دونوں کے سر میں قلب مکرر ہے واہ واہ
'خالی تھا جام اور پئے جاتے تھے جگر'
تصویر حال وجد کا منظر ہے واہ واہ

اس کے بغیر چل نہ سکی 'گفتگو حق'
غالب ہیں اور 'بادہ و ساغر' ہے واہ واہ
واقف نئی زمین ، اچھوتی ردیف ہے
ہر شعر میں یہ دیکھئے کیوں کر ہے واہ واہ

[٦]

'غنڈوں' کو انگلیوں سے اشارہ کرے کوئی
سارا 'پلان' ان کو بتایا کرے کوئی
بجلی کی طرح 'چرخ' پہ چمکا کرے کوئی
بادل کی طرح 'جلسہ' میں گرجا کرے کوئی
ساقی اگر ہو دشمن ایمان و آگہی
کم ظرفی خیال گوارا کرے کوئی
جب ہاتھ آگئی ہے سیاست کی ڈگڈگی
'بندر' کی طرح سب کو نچایا کرے کوئی
فرد حساب جرم تمنا نہ مل سکی
کیوں بار بار اس کا تقاضا کرے کوئی
ہر ایک 'ذی خیال' ہے خنجر لیے ہوئے
کس کس حرام زادے کا شکوہ کرے کوئی
دیتا ہے ملک 'دعوت نظارۂ فساد'
آنکھوں کو اپنی محو تماشا کرے کوئی
'سنگم' کی سرخیاں ہیں شہیدوں کی داستاں
'افسانۂ حیات' سنایا کرے کوئی
ترتیب 'نفس ہائے مظالم' ضرور ہے
فوراً پریس رپورٹ مہیا کرے کوئی
جو تو نے ان کے کانوں میں چپکے سے کہہ دیا
اب پھر کہیں نہ 'وعدۂ فردا' کرے کوئی
'مجنوں کا ووٹ کیا ہے؟ ملے گا مگر ہے شرط
حاصل مقام ناقۂ لیلیٰ کرے کوئی

اکتا گئی ہے اپنی طبیعت خدا گواہ
کب تک بتوں کے سامنے سجدہ کرے کوئی
واقف زمین حضرت غالب ہے فیض بخش
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی

[۷]

دوستو! گر جھوٹ کی پھٹکار بڑھتی جائے گی
دیکھتے جانا 'خدا کی مار' بڑھتی جائے گی
'ٹھپہ بازی' پر ہے جب دار و مدارِ انتخاب
آپ گھٹتے جائیں گے سرکار بڑھتی جائے گی
'رشوت آباد عمل' ہے کاروبار زندگی
اور ابھی یہ گرمی بازار بڑھتی جائے گی
'اختلاط خیر و شر' غنڈوں میں گر قائم رہا
یہ خلیج کافر و دیندار بڑھتی جائے گی
ماننے کی بات کو بھی گر نہ مانے گا کوئی
بحث بڑھتی جائے گی تکرار بڑھتی جائے گی
مجرموں کی دھر پکڑ سے ہوگی گر پہلو تہی
طاقت ہر 'مردم خونخوار' بڑھتی جائے گی
کیف اندر کیف ہے یا لطف اندر لطف ہے
آپ پڑھئے! لذت اشعار بڑھتی جائے گی

[۸]

اچھی نہیں ہمیشہ حقیقت کی بات چیت
کرتے ہیں لوگ اس سے شرارت کی بات چیت
مومن ہلاک لذت افطار ہوگیا
لیکن زباں پہ اس کی ہے جنت کی بات چیت
وہ آئے جب تو بحث کا نقشہ بدل گیا
کل سے چھڑی ہوئی تھی حماقت کی بات چیت
ہر روزہ دار مفتی اسلام ہوگیا

ہر مسئلہ میں کرتا ہے جنت کی بات چیت
روزہ میں کھل کے ہوتی ہے دو مفتیوں میں جنگ
اور اس کے بعد صاف جہالت کی بات چیت
کرتے ہیں ضبط غصہ کو دونوں بہ جبر و قہر
رہ جاتی ہے ادھوری شجاعت کی بات چیت
مغرب کے بعد چھڑتی ہے پھر ٹھنڈی ٹھنڈی جنگ
ہوتی ہے سرد سرد امانت کی بات چیت
ایسے بھی خال خال ہیں جن سے اگر ملو
کرتے ہیں کچھ شگفتہ طبیعت کی بات چیت
رکھتے ہیں وہ بلندیٔ گفتار فطرتاً
شکوے کا شائبہ نہ شکایت کی بات چیت
دشمن کے نام کو بھی وہ لیتے ہیں اس طرح
اڑ جاتی ہے ہوا میں عداوت میں بات چیت
اور ایسے روزہ دار بھی ملتے ہیں صبح و شام
ہوتی ہے جن و انس میں وحشت کی بات چیت
ذکرِ عذاب قبر زباں پر ہے رات دن
ملتے ہی چھیڑتے ہیں قیامت کی بات چیت

[۹]

اٹھا میں کر کے ترک تمنا ابھی ابھی
کرنے لگا وہ شوخ تماشا ابھی ابھی
فوجِ عدو ہوئی ہے صف آرا ابھی ابھی
بننا ہے مجھ کو چھپ کے گوریلا ابھی ابھی
جو زخم خوردۂ ستم روزگار ہے
کرنا ہے مجھ کو اس کا مداوا ابھی ابھی
ماتم نشین عقل ہے مسجد میں اک 'امام'
کھاکر فریب وعدۂ 'اندرا' ابھی ابھی
لایا مرا ملازم احمق میں کیا کہوں

’آلو‘ کے ساتھ آلو بخارا ابھی ابھی
ہیں وہ خموشی لب ساحل بنے ہوئے
الٹی بہا چکے ہیں جو گنگا ابھی ابھی
کیا جانیں وہ کہ ’قوم کی خدمت‘ ہے کس کا نام
آیا ہے جن کی جیب میں پیسہ ابھی ابھی
نیچی نگاہ کرکے چلے جارہے ہیں وہ
اونچا ہوا ہے جن کا ’ترنگا‘ ابھی ابھی
’کاکاتوا‘ نے ’کانگریس آئی‘ سے کہہ دیا
الو ہوا ہے آپ کا سیدھا ابھی ابھی
چھیڑا تھا جس نے ’نغمہ اندرا‘ بہ ساز نرخ
بھاگا ہے چھوڑ چھاڑ کے طبلہ ابھی ابھی

[۱۰]

لیلیٰ کرے گی زلف پریشاں ادھر ادھر
مجنوں بھی ہوگا چاک گریباں ادھر ادھر
کھاتے پھریں گے لوگ ’سویاں‘ ادھر ادھر
ملتے پھریں گے ’عید‘ مسلماں ادھر ادھر
شاعر غریب ہوں گے غزل خواں ادھر ادھر
لیڈر بھی ہوں گے قوم پہ قرباں ادھر ادھر
کرتے پھریں گے ’لو‘ کے تھپیڑوں کا سامنا
مارے پھریں گے ’کودک ناداں‘ ادھر ادھر
قطرہ جو بن کے قطرۂ ناچیز رہ گیا
برپا کرے گا جوش میں طوفاں ادھر ادھر
ہوگی دراز آنکھ مچولی کی داستاں
’لوفر‘ جو ہوں گے سلسلہ جنباں ادھر ادھر
بو موتیئے کی آئے گی موتی کے ہار سے
وہ گل جو ہوگا سروخراماں ادھر ادھر
ابلیس ہوگا مست مئے جام حریت

ننگا پھرے گا لشکر شیطاں ادھر ادھر
'نطشے' کی روح ہوگی 'سپرمین شپ' کے ساتھ
ہوگا 'خودی' کا مرغ پریشاں ادھر ادھر

نظمیں

[۱] یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے

تعزیت ہو غیر مسلم کی تو یہ جائز نہیں
اور ایصال ثواب و فاتحہ جائز نہیں
منحرف جو اس سے ہو وہ مرتد انجام ہے
منکر آیات قرآں دشمن اسلام ہے
ایسی حرکت کا حقیقی مدعا چیلنج ہے
یہ مسلمانوں کی غیرت کو کھلا چیلنج ہے
اس امارت اور جمعیۃ کے علمائے کرام
اس ادارہ شرعیہ کے مفتیان خوش مقام
ایسی حرکت پر اگر خاموش ہوں زیبا نہیں
اپنے حجروں میں اگر روپوش ہوں زیبا نہیں
ان کو رکھنا چاہئے چہروں کو اپنے بے نقاب
ہو زباں پر ان کے جاری معنی ام الکتاب
نصرت دین شہ خیر الوریٰ ہے ان کا نام
حفظ آئین محمد مصطفےؐ ہے ان کا کام
وہ نہ بولیں گر تو مجرم ہیں خدا کے سامنے
اپنے خالق مالک ارض و سما کے سامنے

[۲] ۱۵/اگست کے نام

تیرا افسانہ ہے آزادی کا عنواں ہونا

تخت دہلی پہ وہ اردو کا نمایاں ہونا
رہنا آزاد کا مرکز میں وزیرِ تعلیم
خانہ جہل کا انگشت بدنداں ہونا
تیرے دربار میں پکھراج پری کا وہ ناچ
اس پہ شہزادۂ گلفام کا حیراں ہونا
چھوٹ جانا تری دہلیز پہ قارونوں کا
فاقہ مستوں کا ترے داخل زنداں ہونا
کفر و اسلام کے جھگڑوں میں تری سعی جمیل
دونوں جانب وہ ترا تاحد امکاں ہونا
تیری پالیسی کے ہے عین مطابق اب تک
بھائی کا بھائی سے ہم دست و گریباں ہونا
تیری برکت سے گرانی کا ستوں قائم ہے
تو نے غلہ کو سکھایا نہیں ارزاں ہونا
تیری مرضی سے ہے یوپی میں سرِشام وسحر
زلف اردوئے معلّٰی کا پریشاں ہونا
ثانوی درجہ اردو پہ بہت خوش ہے بہار
اس کی قسمت تھی ترا بندۂ احساں ہونا
مردِ مومن ہے وہی صاحبِ ایماں ہے وہی
قومی یکجہتی پہ آئے جسے قرباں ہونا
نکسلائٹ بھی ترے اور پولس بھی تیری
دونوں کانٹوں کو ہے گلزار و گلستاں ہونا
درِ لیلیٰ پہ ترے مجنوں کا وہ روزہ موت
اسٹمک اتیج میں ذرہ کا درخشاں ہونا
تیری جگنی کا چمک کر وہ عروج پرواز
تیرے جگنو سے وہ جنگل میں چراغاں ہونا
تیرے ساحل پہ ہے بھیگے ہوئے الو کی طرح

جس کو اے پندرہ اگست آتا تھا طوفاں ہونا
لکھ دیا اس نے تجھے ایک محبت نامہ
تھا سٹائر میں جو واقف کو غزل خواں ہونا

[۳] مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں

یہی حدیث تھی فردوس رنگ و بو ان کی
اسی نے جان گلستاں بنا دیا ان کو
نسیم صبح علی گڑھ تھے اور کیا تھے وہ
اسی کے فیض نے طوفاں بنا دیا ان کو
وہ عندلیب نوا سنج باغ فطرت تھے
اسی نے شیر نیستاں بنا دیا ان کو
علیگ اور وہ تھے 'بی اے آکسن' لیکن
اسی نے حامل قرآں بنا دیا ان کو
اسی سے سنت یوسف نے ان کو پیار کیا
اسی نے زینت زنداں بنا دیا ان کو
اسی سے ان کی نوا تھی صدائے اسرافیل
اسی نے حشر بداماں بنا دیا ان کو
یہی حدیث محمد علی کا جوہر تھی
اسی نے صاحب عرفاں بنا دیا ان کو

[۴] حالات حاضرہ کی بے ہودہ سامانیاں

روز وصال بھی شب ہجراں ہے آج کل
فتنہ فساد کار نمایاں ہے آج کل
اصغر نے جو کہا تھا وہ بالکل درست ہے
کانٹوں کو بھی غرور گلستاں ہے آج کل
اولاد بابری کو مٹا دیں گے ہیجڑے
چیلنج یہ بنام مسلماں ہے آج کل
کوؤں کی کائیں کائیں میں اعلان صبح ہے

داغ سیاہ مہر درخشاں ہے آج کل
نفرت ہے اتحاد سے ہر بدمعاش کو
اس کاروبارزیست میں نقصاں ہے آج کل
سایہ ہے اس پہ گیسوئے سرمایہ دار کا
بالکل سیاہ شام غریباں ہے آج کل
ہر چیز کی گرانی ہے سربرفلک نہ پوچھ
لے دے کے اپنا خون ہی ارزاں ہے آج کل
ہرسمت ہُن برستی ہے رتھ کے جلوس پر
یہ لیڈری بھی گنج فراواں ہے آج کل
کتنا حسیں ہے نقشہ ارباب انتظام
تصویر یار پردۂ عریاں ہے آج کل
دیتی ہے ککڑوکوں کی صدا عندلیب بھی
مرغ جنون جنگ پرافشاں ہے آج کل

[۵] علامہ اقبال مرحوم کی یاداور منہ بولتی پیروڈی

نمازوں میں ہے رمضانی خودی کی
ہے روزہ میں فراوانی خودی کی
ہر اک مشکل ہے آسانی خودی کی
کہ دانائی ہے نادانی خودی کی
حقیقت میں نے پہچانی خودی کی
مری دادی جو تھیں نانی خودی کی
جو دیکھے گل بدامانی خودی کی
کرے رضواں بھی دربانی خودی کی
یہ پیروڈی ہے لاثانی خودی کی
حکیمی نے مسلمانی خودی کی
تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

[۶] معلوم نہیں کیوں؟

چالاک ہے ، عیار ہے معلوم نہیں کیوں؟
جو شخص ہے مکار ہے معلوم نہیں کیوں؟
بے نور ہے ہر صبح تو بے رنگ ہے ہر شام
دن رات سے بیزار ہے معلوم نہیں کیوں؟
ہر شخص پڑوسی کا گلا گھونٹ رہا ہے
یہ حاصل اخبار ہے معلوم نہیں کیوں؟
کرفیو بھی ہے اور فوج بھی امن واماں بھی
پنہاں بھی پدیدار ہے معلوم نہیں کیوں؟
جب ختم ہوئی گرمی بازار محبت
دل اس کا خریدار ہے معلوم نہیں کیوں؟
ہے فلسفہ تسبیح کا معلوم نہیں کیا؟
یہ رشتہ زنار ہے معلوم نہیں کیوں؟
کہتے ہیں وہ سن کر مرے اشعار کو واقف
ہر شعر مزیدار ہے معلوم نہیں کیوں؟

[۷] حالات حاضرہ کے گردوپیش طنز و تغزل

نسیم صبح گر پھولوں کو خنداں کر نہیں سکتی
تو زیادہ دیر تک سیر گلستاں کر نہیں سکتی
اگر مردہ ضمیروں کے عقب میں تیغ درکف ہوں
تو ملت اپنی کس مشکل کو آساں کر نہیں سکتی
ہے قوم مسلم خستہ کو الفت ٹکنالوجی سے
مگر وہ بابری مسجد کو قرباں کر نہیں سکتی
ہیں شائستہ چمن میں ہر طرف اٹکھیلیاں اس کی
صبا اردو کی زلفوں کو پریشاں کر نہیں سکتی
ہوئی لیلیٰ بھی عاشق حضرت مجنوں پہ بالآخر
مگر وہ چاک داماں وگریباں کر نہیں سکتی

[۸] ایک برخود غلط دوست کے نام

آپ قطرہ سے اگر موج میں دریا ہو جائیں
لاکھوں طوفان جو پنہاں ہیں وہ پیدا ہو جائیں
ایٹمک ایج میں گر آپ بھی ذرہ ہو جائیں
مرکز کثرت انوار تماشا ہو جائیں
ہر طرف امت مرحوم ہو خاکم بدہن
آپ اگر حضرت اقبال کا شکوہ ہو جائیں
چاہیں گر آپ علاج دل مسلم کرنا
درد ملت میں گراں قدر اضافہ ہو جائیں
آپ اسٹیج پہ اٹھلاتے ہوئے آئیں اگر
انہیں قدموں کی قسم کیا سے ابھی کیا ہو جائیں

[۹] کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

کہنے لگے جمن سے کل حضرت درگاہی
اللہ کرے کم ہو کچھ تیری کم آگاہی
اس دور کی فطرت ہے عیاری و مکاری
بدگوئی و بدبینی بدخوئی و بدخواہی
اب طائر لاہوتی عنقائے تصور ہے
جب آگئی شاہیں کے پرواز میں کوتاہی
جب صوفی و ملا ہوں دربار وزارت میں
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

[۱۰] دورخی چال کی بازی ہے سیاست اے دوست

دورخی چال کی بازی ہے سیاست اے دوست
یہی افسانہ ہے دنیائے حقیقت اے دوست
عشق ہو جائے اگر تجھ کو ڈبل ڈیلنگ کی
تیرے ہاتھوں کا کھلونا ہو وزارت اے دوست
ذوق کی قبر پہ ہوتا شہ دہلی افسوس

اور پٹنہ میں ہوا جشن ظرافت اے دوست
حشر کیا ہوگا بتا مسلم شوریدہ کا
جب رگوں میں نہ رہا خون حمیت اے دوست
حال پنجاب کا معلوم ہے کیا کہنا ہے
اس کے فتنوں میں ہے انداز قیامت اے دوست
اپنا پیغام زمانے میں سنا دے سب کو
ہم ہیں منجملہ ارباب سیاست اے دوست

اعترافات واعزازات

* اپریل ۱۹۸۳ء: محکمہ راج بھاشا، بہار سے تاحیات چار سو روپے ماہوار وظیفہ جاری۔
* ۲۲/اکتوبر ۱۹۸۸ء: خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری، پٹنہ کے زیر اہتمام ''ایک شام واقف کے نام'' کا انعقاد۔

بعداز مرگ:

* ۱۸/ستمبر ۱۹۹۴ء: ''حلقہ احباب''، آرا کے زیر اہتمام یوم واقف کا انعقاد۔
* ۱۹۹۶ء: ''علامہ واقف عظیم آبادی: حیات وخدمات'' قمر ثاقب کے تحقیقی مقالے پر بہار یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ۔
* ۱۹۹۶ء: ''زبان وادب''، پٹنہ جلد ۲۲ شمارہ ۲-۱ واقف عظیم آبادی پر خصوصی گوشہ۔
* جنوری ۲۰۰۳ء: شعری مجموعہ ''لطف ستم'' (مرتبین: سید جاوید حسن رزیا تبسم) کی اشاعت۔
* ۲۰۰۶ء: ''مضامین واقف عظیم آبادی'' (مرتب: اکبر امام کاشف) کی اشاعت۔
* ۲۰۰۷ء: ''رازہائے درونِ پردہ'' (مرتب: اکبر امام کاشف) کی اشاعت۔
* ۲۰۰۸ء گلدستۂ نعت ومنقبت
* ۲۰۱۱ء طنزیات واقف (واقف آرٹ کا انتخاب)
* ۱۸/مارچ ۲۰۱۸ء: اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، بہار پٹنہ کے زیر اہتمام واقف یادگاری تقریب۔



Monograph-6

Allama Waaqif Azeemabaadi

By Dr. Nasim Akhtar





دبستان بہار کی ایک اہم ادبی وشعری شخصیت کا نام واقف عظیم آبادی ہے۔ان کی پیدائش ۸؍مارچ ۱۹۱۲ء کو ارول (جہان آباد) میں ہوئی۔۴؍سال کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا تو ان کی والدہ ان کو لے کر آرہ چلی آئیں اور محلہ چودھرانہ میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئیں۔ جہاں اُن کی عمر کا طویل حصہ گزرا۔۱۹۶۶ء میں وہ شادی کے بعد اپنی سسرال گولک پور، پٹنہ میں ہی بس گئے۔اسی لئے کچھ لوگ ان کو واقف عظیم آبادی اور کچھ لوگ واقف آروی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

واقف عظیم آبادی کو فارسی، عربی اور اردو زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی۔وہ اردو کے ایک بلند پایہ سخنور تھے۔طویل عرصے تک پٹنہ کے روزنامہ 'سنگم'، 'صدائے عام'، 'قومی تنظیم' اور 'ہمارا نعرہ' میں واقف آرٹ کے عنوان سے مزاحیہ قطعات لکھتے رہے اور علامہ واقف کے نام سے شہرت مقبولیت اور عزت حاصل کرتے رہے۔وہ ایک قادر الکلام اور غضب کے ذہین شاعر تھے۔وہ فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔لوگ اُن سے گھنٹے بھر میں طویل سہرے لکھوا کر لے جاتے تھے۔اِس فن میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

واقف عظیم آبادی بڑے کثیر المطالعہ اور دانشورانہ صلاحیتوں کے حامل شاعر وادیب تھے۔ان کی علمی و دانشورانہ اہمیت کے پیش نظر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ان کو ۱۹۸۵ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک روزانہ لائبریری میں مدعو کیا اور انھیں اپنی یادداشت قلم بند کرنے کو کہا۔واقف کی یہ قیمتی تحریر لسانی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، مذہبی اور تحقیقی اعتبار سے دستاویزی حیثیت کی حامل ہے اور یہ خدا بخش لائبریری میں بارہ جلدوں میں محفوظ ہے۔

اس فردنامہ کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر ایک اچھے محقق، مبصر، صحافی، ادیب اور ناقد ہیں۔ا زبان صحافت اور ادب سے ان کا گہرا لگاؤ ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک بہترین محقق ہیں اور ان کی تحر تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں۔ملک کے صف اول کے دانشوران ادب اور ناقدین نے نسیم اخت تحریر وتصنیف کی ستائش کی ہے۔ ۱۔تاثرات ۲۰۰۲ء، ۲۔نیپال میں اردو ۲۰۰۴ء، ۳۔تلاش وتصنی ۲۰۱۳ء، ۴۔طرز سخن ۲۰۱۴ء، ۵۔باتیں 2015ء، ۶۔رنگ وآہنگ ۲۰۱۶ء تحقیقی نوعیت کی قابل مط کتابیں ہیں۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक

उर्दू निदेशालय

मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना